پاکستان کا جمہوری سفر

پارلیمنٹ کا کردار اور روایات

پروفیسر خورشید احمد

آئی پی ایس پریس، اسلام آباد

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز تحقیق کے لیے آزادانہ اظہار خیال کی حوصلہ افزائی کرتا ہے
ادارہ کی مطبوعات میں پیش کیے گئے تمام خیالات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

© IPS Press 2022

پاکستان کا جمہوری سفر: پارلیمنٹ کا کردار اور روایات

پروفیسر خورشید احمد

انتخاب، ترتیب و تدوین: خالد رحمٰن

معاونت: محمود فاروقی

ISBN: 978-969-448-823-3

جملہ حقوق محفوظ ہیں: آئی پی ایس پریس، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد کی تحریری اجازت کے بغیر اس کتاب کے کسی حصے کی نقل یا ترجمہ کی اشاعت، کسی بھی شکل میں اسٹوریج جہاں سے اسے دوبارہ حاصل کیا جاسکتا ہو یا کسی بھی شکل میں ترسیل نہیں کی جاسکتی۔

۳۲۸۔۱۰۹۵۴۹۱ء
خ ور

پاکستان کا جمہوری سفر: پارلیمنٹ کا کردار اور روایات
خورشید احمد، پروفیسر
اسلام آباد: آئی پی ایس پریس، ۲۰۲۲ء
۲۱۴ صفحات مع اشاریہ
۱۔ پاکستان - پارلیمانی جمہوریت - تاریخ
۲۔ پاکستان - سیاست و حکومت ۳۔ جمہوریت - پاکستان

PRESS

آئی پی ایس پریس

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، نصر چیمبرز، پلاٹ-1، ایم پی سی ایچ ایس، کمرشل سینٹر، E-11/3، اسلام آباد
فون: ۰۵۱-۸۴۳۸۳۹۱ فیکس: ۰۵۱-۸۴۳۸۳۹۰
ای میل: publications@ips.net.pk
ویب سائٹ: www.ipsurdu.com, www.ips.org.pk
فیس بک: www.facebook.com/IPSPressInternational

سرورق: آصف تیموری
الفاظ و صفحہ سازی: محمد عالم
طباعت: اے-ایس پرنٹرز، راولپنڈی

فہرست

— پیش لفظ V

— تعارف VII

——— حصہ اول ———

آئینی و پارلیمانی مناصب پر تقرریاں: قانونی و اخلاقی تقاضے

باب نمبر ۱: - منصبِ صدارت: تقرری، حلف اور اس کے تقاضے ۰۳

باب نمبر ۲: - قائدِ ایوان، سینیٹ چیئرمین اور ڈپٹی چیئرمین کے مناصب کا انتخاب ۱۹

باب نمبر ۳: - اراکین پارلیمنٹ کی پارٹی وابستگی اور اختلاف کی حدود ۳۱

——— حصہ دوم ———

پارلیمنٹ سے صدارتی خطابات پر تبصرے

باب نمبر ۴: - صدارتی خطاب: دعوے، حقائق اور لائحہ عمل ۵۹

[جنرل پرویز مشرف کے خطاب پر تبصرہ (۲۰۰۴ء)]

باب نمبر ۵: - حکومتی وعدوں کے برعکس پرانی پالیسیوں کا تسلسل ۸۱

[آصف علی زرداری کے خطاب پر تبصرہ (۲۰۰۸ء)]

باب نمبر ۶: - اچھی حکمرانی کا فقدان (۱) ۹۷

[آصف علی زرداری کے خطاب پر تبصرہ (۲۰۱۰ء)]

باب نمبر ۷: - اچھی حکمرانی کا فقدان (۲) ۱۱۵

[آصف علی زرداری کے خطاب پر تبصرہ (۲۰۱۱ء)]

حصہ سوم

پارلیمنٹ اور قانون سازی: قواعد، آداب اور روایات

باب نمبر۸: - آرڈیننس کے ذریعہ قانون سازی..... ۱۳۱

باب نمبر۹: - آئینی پابندیاں اور قواعد کار..... ۱۴۳

باب نمبر۱۰: - چیئرمین سینیٹ (یا اسپیکر) کا کردار..... ۱۵۱

• گرفتار رکن کی پارلیمنٹ میں حاضری • قواعد کی معطلی کی روایت • چیئرمین اور اسپیکر کی غیر جانبداری

حصہ چہارم

سینیٹ کی کارکردگی اور آئندہ کردار

(رکنیت کے ۲۱ سالہ تجربات کی روشنی میں)

باب نمبر۱۱: - الوداعی خطاب: ۲۰ مارچ ۱۹۹۷ء..... ۱۶۹

باب نمبر۱۲: - الوداعی خطاب: ۹ مارچ ۲۰۱۲ء..... ۱۷۷

اشاریہ..... ۱۹۱

پیش لفظ

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو بیش بہا انعامات سے نوازا ہے۔ ایک جانب دیگر ہزاروں مخلوقات کی طرح اس کی جسمانی اور طبعی ضروریات کو پورا کرنے کا انتظام فرمایا، تو دوسری جانب اس کا رتبہ ان تمام مخلوقات سے بلند کر کے اس کی اخلاقی، تہذیبی، تمدنی اور روحانی نشوونما کو بھی اپنے ذمہ لے لیا۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے سوا لاکھ کے قریب انبیاء علیہم السلام دنیا کے مختلف خطوں اور مختلف اوقات میں مبعوث فرمائے۔ یہ سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر حضرت محمد ﷺ پر تکمیل پذیر ہوا۔ ان انبیاء کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی علمی، اخلاقی اور فلسفیانہ ہدایت کے لیے وحی کا ایک سلسلہ شروع کیا جو قرآنِ کریم پر منتج ہوا۔ آخری پیغمبر ﷺ کی آمد کے ساتھ جہاں کارِ نبوت تکمیل کو پہنچا، وہیں قرآنِ کریم کی تکمیل کے ذریعے الہامی ہدایت کا سلسلہ مکمل ہوا۔ یوں قرآن و سنت کی صورت میں ایک ایسا نقشۂ زندگی انسانیت کو میسر آ گیا جو زندگی کے ہر گوشے اور ہر دائرے میں رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

انسانیت کے ارتقا اور علم و عمل کے نئے ذرائع کی دریافت نے انسان کو کسی حد تک آزادیٔ فکر سے نوازا تو وہ اس خام خیالی کا شکار ہو گیا کہ وہ اب الہامی ہدایت سے بے نیاز ہو گیا ہے۔ اس کا نتیجہ ظلم، عدم مساوات اور طاغوتی طاقتوں کے غلبے کی صورت میں نکلا۔ اسی خام خیالی نے دنیا کو اس استعماری نظام کے شکنجے میں لا ڈالا جس کی ہر صورت افراد اور اقوام کے استحصال پر منتج ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے فی زمانہ انسانی زندگی کے تمام دائرے اور تمام شعبے اس سے براہِ راست متاثر ہیں۔ اس پر مستزاد وہ ذہنی پسماندگی اور مغلوبیت کی کیفیت ہے جس کی وجہ سے کسی متبادل کی تلاش میں انسانوں کی اکثریت سرگرداں ہونے کے باوجود محروم ہے۔

میں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ تعلیم و تحقیق، تصنیف و تالیف، اور سیاسی تحرّک میں گزارا ہے۔ اس پورے عرصے میں میری کوشش یہی رہی کہ حتمی الہامی ہدایت یعنی قرآن و سنت کی

جامع تعلیمات کی روشنی میں قومی اور بین الاقوامی مسائل کا حل تلاش کیا جائے۔ چنانچہ علمی و عملی جدوجہد کے دوران یہ مقصد میرا مرکزِ نگاہ تھا کہ اپنی صلاحیت اور دائرہ اختیار کے مطابق وطنِ عزیز پاکستان کو بالخصوص اور عالمِ انسانیت کو بالعموم استعماری گرفت سے آزاد کروا کر فلاح و ہدایت کے اس راستے پر گامزن کرنے کی جدوجہد میں اپنا حصہ شامل کیا جا سکے جو الہامی ہدایت کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔

اس ضمن میں نظریاتی و عملی پہلوؤں پر میں نے اللہ تبارک و تعالیٰ کی توفیق سے سینکڑوں مضامین تحریر کیے ہیں اور بے شمار مواقع پر گفتگو کی صورت میں اپنے خیالات کا ابلاغ کیا ہے۔ اس میں سے بہت کچھ گزشتہ دہائیوں میں مربوط صورت میں شائع بھی ہوا ہے لیکن ایک بہت بڑا لوازمہ ابھی ایسا موجود ہے جسے ترتیب دینے کی ضرورت باقی ہے۔ یہ فرض انجام دینے کی خواہش میں کئی برس سے اپنے اندر پاتا ہوں لیکن صحت کی صورتِ حال کے باعث یہ ممکن نہ ہو سکا کہ اپنے ماضی کے کام کا جائزہ لے کر اسے اشاعت کے لیے مرتب کر سکتا۔

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے ساتھیوں نے برادرم خالد رحمٰن کی سربراہی میں اس ادھورے کام کی تکمیل کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے۔ پہلے مرحلے میں پاکستان کی نظریاتی اساس، ملک میں آئینی جدوجہد، طرز حکمرانی کے سوال، دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاک امریکہ تعاون، اسلام اور مغرب کے باہمی تعلق اور جاری کشمکش، اور معاشی صورت حال اور امکانات جیسے موضوعات پر آٹھ کتب مرتب ہو چکی ہیں۔ کچھ دنوں میں دو اور کتب بھی مکمل ہونے کو ہیں، ان شاءاللہ۔ ان کتب کا حصہ بننے والے بیشتر مضامین میری سینیٹ کی تقاریر پر مبنی ہیں جبکہ دیگر مضامین مختلف مواقع پر لکھے گئے جن کو اب یکجا کر دیا گیا ہے۔

میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے ساتھیوں کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے انتہائی محنت، عرق ریزی اور قابلیت کے ساتھ یہ لوازمہ ترتیب دیا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہماری سعی کو قبول فرمائے اور ہماری کاوشوں کو اپنے لیے خالص کر لے۔

پروفیسر خورشید احمد

لیسٹر، برطانیہ

تعارف

جمہوریت کی جانب پاکستان کا سفر اگرچہ کبھی بھی ہموار نہیں رہا ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس قدر تبدیلی ضرور واقع ہوئی ہے کہ بہت سے حادثات کے باوجود ۱۹۷۳ء کا دستور نہ صرف نافذ ہے بلکہ مختلف ترامیم کے ذریعہ اس میں آنے والے بگاڑ کی بھی اصلاح کی جاتی رہی ہے۔ آٹھویں، ۱۷ویں اور ۱۸ویں ترامیم اس حوالہ سے اہم اور خصوصی طور پر قابلِ ذکر پیش رفت ہیں۔ دستور کے اس تسلسل کا ہی ایک نتیجہ عوامی نمائندگی کے لیے مسلسل انتخابات ہیں۔

انتخابی عمل اور ان کے نتائج کے حوالہ سے صورتحال کو اگرچہ کسی بھی طرح مثالی قرار نہیں دیا جاسکتا اور بلاشبہ اس میں انتخابی نظام سے لے کر اس پر عمل درآمد کے حوالہ سے بہت سی اصلاحات کی ضرورت ہے۔ تاہم اس پورے عمل میں پارلیمانی نظام کے تحت ایک ادارتی ڈھانچہ وجود میں آچکا ہے۔ دو ایوانی پارلیمنٹ اور صدرِ مملکت مل کر وفاقی سطح پر اس ڈھانچہ کی تکمیل کرتے ہیں۔

پارلیمنٹ کوئی بھی ہو اس میں انفرادی طور پر اپنا کردار ادا کرنے کے ساتھ ساتھ ہر رکن، حکومت، حزب اختلاف اور کسی جماعت یا آزاد گروپ کے حصہ کے طور پر کام کرتا ہے۔ اسی پس منظر میں پارلیمنٹ کی کارروائی کو چلانے کے لیے مختلف مناصب پر انتخاب اور تقرریاں ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی کمیٹیاں تشکیل پاتی ہیں جو اپنے اپنے دائرہ کار کے حوالہ سے سرگرم رہتی ہیں۔

کسی بھی دوسرے نظام اور ادارہ کی طرح پارلیمنٹ کی کامیابی کا انحصار اس پہلے قدم پر ہے کہ جس بنیادی قانون یعنی دستور کے تحت وہ قائم ہوتی ہے اس میں اس کا مقام اور کردار واضح طور پر متعین ہو اور اسی حوالہ سے اسے چلانے کے لیے موثر اور واضح قواعد وضوابط

تشکیل پا جائیں۔ تاہم یہ پہلا قدم اسی وقت موثر نتائج دے سکتا ہے جب تمام اسٹیک ہولڈرز دستور میں دیے گئے مقام اور اس سے متعلق قواعد وضوابط پر ان کے الفاظ اور ان کی روح (letter and spirit) کے مطابق پوری طرح عمل کر رہے ہوں۔ اور سب سے بڑھ کر خود پارلیمنٹ کے اراکین اور اس کے مناصب پر فائز ذمہ داران اس کے لیے مخلصانہ طور پر فکر مند ہوں۔

اس ضمن میں عوام اور ملک کے مفاد میں قانون سازی کے بنیادی کام، حکومتِ وقت کی پالیسیوں اور کارکردگی کا مسلسل جائزہ اور احتساب، عوام کے جذبات کی ترجمانی اور ان کے حقوق کا تحفظ جیسے تمام کام ارکان پارلیمنٹ کے لیے بیک وقت ان کے حق اور فرض کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس حق اور فرض کی ادائیگی پارلیمنٹ میں کس طرح موثر انداز میں ہو سکتی ہے۔ اس میں پارلیمنٹ اور اس کے ارکان نے از خود سیکھنا اور اپنے لیے روایات قائم کرنا ہوتی ہیں اور اس عمل میں دنیا کے جمہوری تجربات میں اس حوالہ سے ہونے والی پیش رفت سے استفادہ بھی ناگزیر ضرورت کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس سیاق وسباق میں زیرِ نظر کتاب "پاکستان کا جمہوری سفر: پارلیمنٹ کا کردار اور روایات" پروفیسر خورشید احمد کی ان تقاریر پر مشتمل ہے جن میں انہوں نے سینیٹ آف پاکستان کی مختلف آئینی پوزیشنوں کی حیثیت، ان پر فائز ذمہ داران کے کردار اور کارکردگی پر بحث کی ہے۔ اس بحث میں فطری طور پر مختلف قواعد وضوابط کار کا پس منظر، ان کی حکمت عملی اور روزمرہ مباحث میں ان کے اطلاق پر نہایت اہم نکات سامنے آتے رہے ہیں۔

پاکستان میں جمہوری عمل کے حوالہ سے یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ مسلسل پیش رفت کے باوجود اسے ابھی بے شمار چیلنجوں کا سامنا ہے۔ لیکن ظاہر ہے یہ ایک جاری سفر ہے۔ درحقیقت کامیابیوں کی تلاش میں کوئی بھی سفر ہو اس میں پڑاؤ تو آتے ہیں اور آنے بھی چاہییں لیکن ہر پڑاؤ پر ایک نئی منزل کا تعین کر کے آگے نہ بڑھا جائے تو ترقی معکوس ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ یوں یہ ایک ایسا طویل سفر ہے جس کی غالباً کوئی انتہا نہیں۔

اس مجموعی تناظر میں ایک جانب یہ لوازمہ پاکستان کی سیاسی صورتحال اور اس میں سرگرم مختلف کرداروں پر تبصرہ ہے اور یوں گزشتہ سالوں کی سیاسی تاریخ بیان کرتا ہے، دوسری جانب یہ سیاسیات کے کسی بھی طالب علم اور خود سیاست کے میدان میں متحرک افراد کے لیے، خواہ وہ نو آموز ہوں یا کسی حد تک تجربہ کار، ایک ایسا لوازمہ ہے جو پارلیمنٹ میں بحث کے قواعد وضوابط، طریقہ کار، آداب اور روایات کو سمجھنے اور مجموعی طور پر پارلیمنٹ کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے مفید راہنمائی فراہم کرتا ہے۔

کتاب کے ابواب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ مختلف آئینی و پارلیمانی مناصب پر تقرریوں کے قانونی واخلاقی تقاضوں سے بحث کرتا ہے۔ دوسرا حصہ پارلیمنٹ میں ہونے والے صدارتی خطابات کے حوالہ سے پروفیسر خورشید احمد صاحب کی چار تقاریر پر مشتمل ہے۔ تیسرے حصہ میں قانون سازی کے قواعد، آداب اور روایات پر بحث کی گئی ہے۔ چوتھا اور آخری حصہ ان دو تقاریر پر مشتمل ہے جو اگرچہ دو مختلف مواقع پر کی گئی ہیں لیکن اپنے اپنے وقت کے تناظر میں سینیٹ کی کامیابیوں اور مستقبل میں اس کے مجموعی کردار کے حوالہ سے تجاویز دیتی ہیں۔

سینیٹ سے اپنے آخری خطاب میں پروفیسر خورشید احمد نے سینیٹ کے اس وقت کے عملہ کا بھی خصوصی طور پر شکریہ ادا کیا ہے۔ اس کتاب اور اس سلسلہ کی دوسری کتب کی تیاری کے لیے آئی پی ایس کی ٹیم کے ساتھ ساتھ ہم پر بھی سینیٹ عملہ کی اس ساری ٹیم کا شکریہ واجب ہے جنہوں نے ان تقاریر کو اپنی منصبی ذمہ داری کے ساتھ ابتدائی طور پر ریکارڈ اور محفوظ کیا۔

خالد رحمٰن

چیئرمین

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز-اسلام آباد

آئینی و پارلیمانی مناصب پر تقرریاں
قانونی و اخلاقی تقاضے

آئینی و پارلیمانی مناصب پر تقرریوں اور ان کے حوالہ سے قانونی و اخلاقی تقاضوں پر اس حصہ میں تین ابواب ہیں۔ پہلے باب میں تین مختلف مواقع پر کی گئی تقاریر شامل ہیں۔ ان تینوں کا تعلق منصبِ صدارت سے ہے۔ ان میں قائم مقام صدر کی تقرری، فوجی وردی میں صدارتی انتخاب اور صدارتی حلف اور اس کے تقاضے کے عنوان سے ملکی سیاسی تاریخ کے بہت اہم موڑوں پر کیے گئے خطابات شامل ہیں۔ دوسرے باب میں شامل دو تقاریر کا تعلق سینیٹ کے مختلف مناصب سے ہے۔ اپنے سیاق و سباق کے مطابق ہر ایک میں اہم نکات کی نشاندہی ہوئی ہے۔ اس حصہ کا تیسرا باب اراکین پارلیمنٹ کی پارٹی وابستگی اور پارٹی سے اختلاف کی حدود سے بحث کرتا ہے

باب نمبر ا

منصبِ صدارت: تقرری، حلف اور اس کے تقاضے

- ا -

مارچ ۱۹۹۳ء میں اس وقت کے وزیر اعظم میاں نواز شریف اور صدرِ مملکت غلام اسحٰق خان کے درمیان صدر اور وزیر اعظم کے درمیان اختیارات کی تقسیم پر اختلافات شدید ہو گئے۔ بالخصوص آئین کی آٹھویں ترمیم کی شق ۵۸(۲)(بی) کے مطابق صدرِ مملکت کو اختیار حاصل تھا کہ وہ نہ صرف وزیر اعظم کو برطرف کر سکتے تھے بلکہ اسمبلی کو بھی تحلیل کر سکتے تھے۔ نواز شریف آئین سے ۵۸(۲)(بی) کو نکالنا چاہتے تھے۔ اس صورتحال میں صدر غلام اسحٰق خان نے وزیر اعظم نواز شریف کو برطرف کر دیا اور اسمبلی بھی تحلیل کر دی۔ بعد ازاں سپریم کورٹ نے صدارتی حکم کو غیر آئینی قرار دیتے ہوئے نواز شریف کی حکومت بحال کر دی لیکن ایوانِ صدر اور ایوانِ وزیر اعظم میں کھچاؤ کے سبب ملکی معاملات متاثر ہونے لگے۔ جب فریقین کسی حل پر نہ پہنچ سکے تو مسلح افواج کے اس وقت کے سربراہ جنرل عبدالوحید کاکڑ نے صدرِ مملکت اور وزیر اعظم سے مذاکرات کر کے دونوں کو استعفیٰ دینے اور نئے انتخابات کرانے پر راضی کر لیا۔

پروفیسر خورشید احمد کی زیرِ نظر تقریر اس موقع کی ہے۔ بعد میں چیئرمین سینیٹ جناب وسیم سجاد نے صدرِ پاکستان کا عہدہ سنبھالا اور ورلڈ بنک میں نائب صدر کی حیثیت سے کام کرنے والے معین قریشی کو نگراں وزیر اعظم مقرر کر دیا۔

قائم مقام صدر کی تقرری

جناب چیئرمین! سینیٹ کی تاریخ میں میرے خیال میں آج ایک نہایت اہم دن ہے جب ہمیں ایک غیر معمولی چیلنج درپیش ہے۔ (نواز شریف) حکومت جو اس وقت تک

زمام کار سنبھالے ہوئے تھی وہ شاید چند گھنٹوں میں رخصت ہونے والی ہے۔ نئی نگراں حکومت کیا ہو گی ہمیں اس کا ابھی کچھ علم نہیں۔ یوں ایک غیر یقینی صورت حال ہے۔

اس ایوان میں ملکی معاملات پر ہم جس طرح گفتگو کرتے رہے ہیں اس میں ایک بڑا پہلو یہ رہا ہے کہ تنقید یا تائید جو بھی ہو ہماری تمام سعی کا ہدف حکومت کی مدد اور ملک کو صحیح طرح سے چلانے میں اپنا کردار ادا کرنے کی کوشش ہے۔ لیکن آج کا جو دن ہے اس میں حقیقت یہ ہے کہ ہم صاف سے نہیں دیکھ پا رہے ہیں کہ جو بات ہم کہہ رہے ہیں اس کا مخاطب کون ہے، کن کانوں میں یہ بات جائے گی، کن دلوں میں یہ اترے گی اور کون ان کی فکر کرے گا۔ فی الواقع یہ بہت عجیب صورت حال ہے اور اس بنا پر میں منظور احمد گچکی صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے ایک اچھے انداز میں ہمیں گفتگو کا ایسا موضوع دیا جو بلاشبہ اس وقت کی ضرورت ہے۔

جنابِ والا! میرے ساتھیوں نے بجا طور پر آپ کو مبارکباد دی ہے لیکن میں یہ جسارت نہیں کروں گا۔ میں اس دن کا انتظار کروں گا جب آپ (سینیٹر وسیم سجاد) اپنی اس ذمہ داری کو جو شاید آج ہی آپ کے کاندھوں پر پڑنے والی ہے بحسن وخوبی انجام دے لیں گے۔ بلاشبہ میں آپ کے لیے دعا کرتا ہوں اور وہ دعا یہی ہے کہ اس ذمہ داری کی ادائیگی میں اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے اور اس کے لیے ضروری صلاحیت اور عزم وہمت عطا فرمائے۔

آپ بہت ہی نازک وقت میں قائم مقام صدر کی ذمہ داری اٹھانے والے ہیں جس کے غیر معمولی تقاضے ہیں۔ بلاشبہ ہمیں آپ سے محبت بھی ہے اور آپ کی صلاحیتوں کے ہم معترف بھی ہیں۔ آپ نے اپنے خلوص، اپنی دیانت اور اپنی محنت کی بنا پر ہمارے دلوں میں ایک گہرا مقام حاصل کیا ہے۔ یہ سب باتیں درست ہیں اور اس بنا پر ہم آپ سے اچھی توقعات بھی رکھتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اس ملک کے لیے بڑا نازک لمحہ ہے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے ایک حکومت جو مینڈیٹ لے کر آئی تھی اسے وسط سفر میں اپنے کام کو

ترک کرنا پڑ رہا ہے۔ ابھی ۲۵ مئی کو ملک کی اعلیٰ ترین عدالت نے جو فیصلہ کیا تھا[1] ہم اس فیصلے کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکے اور مجبور ہو کر اب ایک نئے انتخاب کی طرف جا رہے ہیں۔

جنابِ والا! یہ بھی خوش آئند بات نہیں ہے کہ سیاسی معاملہ اہل سیاست کے درمیان طے نہ ہو سکا۔ صدر اور وزیر اعظم جو دستور کے تحت ایک ٹیم کا حصہ ہیں اور جنہیں مل کر چلنا چاہیے، خواہ ان میں اختلاف بھی ہو، وہ ایک ساتھ چلنے کے لیے تیار نہ ہو سکے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جمہوری نظام میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ فرانس میں آپ کو معلوم ہے کہ فرانسس متراں (Francois Mitterrand) سوشلسٹ صدر تھا اور جیک شیراک (Jacques Chirac) اس کی مد مقابل پارٹی کا وزیر اعظم تھا۔ آج بھی وہاں صدر اور وزیر اعظم دو مختلف پارٹیوں سے متعلق ہیں اور دو مختلف پروگراموں کے حامل ہیں۔ ہندوستان میں بھی آپ کو معلوم ہے کہ مرارجی ڈیسائی (Morarji Desai) وزیر اعظم بنے تو صدر اور وزیر اعظم دو مختلف پارٹیوں سے متعلق تھے۔ لیکن ہمارے یہاں صدر غلام اسحٰق خان اور وزیر اعظم میاں نواز شریف سیاسی حدود میں رہ کر کام نہیں کر سکے، نہ ہی وزیر اعظم نواز شریف اور قائدِ حزبِ اختلاف محترمہ بے نظیر بھٹو آپس میں گفتگو کر سکے۔ بد قسمتی سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ سیاستدان اور پارلیمنٹ میں جو پارٹیاں ہیں وہ بیٹھ کر نئے انتخابات کے بارے میں کوئی ٹائم ٹیبل طے کر لیتے۔ اس کے لیے فوج کو آگے آنا پڑا۔ بلاشبہ ہمیں اطمینان ہے کہ ہماری فوج کی اس وقت کی قیادت نے دستور کا احترام کیا اور دستور کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے مسائل کا حل نکالنے کی کوشش کی۔ یہ قابلِ قدر اور قابلِ فخر بات ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بات قابلِ افسوس بھی ہے کہ اہل سیاست خود اس بات کو طے نہ کر سکے اور جب تک فوج مداخلت پر مجبور نہ ہوئی ہم کوئی فارمولا نہ بنا سکے۔

جنابِ والا! ہماری قومی زندگی میں اور ہماری سیاست کے لیے یہ ایک بوجھل مرحلہ ہے

---

[1] اشارہ اس فیصلہ کی جانب ہے جس کے تحت ۱۹۹۳ء میں عدالت عظمیٰ نے نواز شریف حکومت بحال کر دی تھی۔

اور آنے والے دنوں میں جو خطرات اور آزمائشیں درپیش ہیں ان تمام کو سمجھتے ہوئے میں دو چیزوں کی طرف آپ کی توجہ خصوصی طور پر مبذول کراؤں گا۔ پہلی چیز کے متعلق میرے بھائیوں نے آپ کو متوجہ کیا ہے وہ اس ملک میں ووٹ کی حیثیت کو قائم کرنا ہے۔ یہ اس ملک میں سیاست کے فروغ، دستور کے تحفظ اور جمہوریت کے فروغ کے لیے بے حد ضروری ہے۔ ماضی میں مختلف طریقوں سے اس ملک میں ووٹ کی حیثیت کو پامال کیا گیا، کچھ نے دھاندلی کر کے اور کچھ نے نتائج تسلیم نہ کر کے۔ اب وقت ہے کہ ہم ماضی کی غلطیوں کا اعادہ نہ کریں۔ میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ الیکشن کو منصفانہ بنانے، بدعنوانیوں سے پاک کرنے اور اس سے بڑھ کر دولت کے اثرات سے پاک کرنے کو اولین اہمیت دیں۔ آج عام آدمی کے درست طور پر یہ احساسات ہیں کہ اس ملک میں الیکشن دولت والوں کا کھیل بن کر رہ گیا ہے اور جس طرح ایک عام انسان کو جمہوریت میں سر اٹھانے کا موقع ملنا چاہیے اسے وہ موقع مل نہیں رہا۔

جنابِ والا! میں متوجہ کروں گا کہ آپ تمام پارٹیوں کو جمع کریں اور ان کے درمیان اصول وضع کریں، ضابطہ اخلاق بنائیں اور جہاں کہیں قانون کی ضرورت ہے اسے رائج کریں اس لیے کہ آرڈیننس کا اختیار آنے والے دنوں میں آپ کو ہی حاصل ہو گا۔ دستور کے تحت وہ راستہ اختیار کیجیے جس کے نتیجے کے طور پر ووٹ کا تقدس صحیح صحیح قائم ہو سکے اور منصفانہ انتخابات ہو سکیں۔ وہ انتخابات ہو سکیں جن پر لوگوں کو اعتماد ہو اور جن میں لوگوں کے حقیقی نمائندے آ سکیں۔ وہ انتخابات جن میں پیسہ نہ چلے اور جن میں پارٹی بدلنے کی لعنت کو ختم کیا جا سکے۔ آپ کی ذمہ داری ہو گی کہ آپ صرف رسمی طور پر الیکشن نہیں کرائیں گے بلکہ الیکشن کے قواعد وضوابط، اس کا قانون اور اس کے لیے جن دیگر چیزوں کی ضرورت ہو گی ان کی فکر بھی کریں اور اس کو سیاسی تصور کے ذریعے سے تشکیل دیں۔

دوسری بات میں یہ کرنا چاہتا ہوں کہ پچھلے چار مہینے سے جس کشمکش میں اس قوم کو مبتلا کر دیا گیا تھا اس کی بناء پر ملک کی پوری زندگی تہہ و بالا ہے۔ معیشت کی حالت یہ ہے کہ زرِ مبادلہ کے ذخائر آج جس مقام پر پہنچ گئے ہیں کبھی اتنے کم نہیں تھے۔ اسٹاک ایکسچینج میں

جو عارضی سرمایہ کاری ہوئی وہ رک گئی ہے۔ قیمتیں بڑھ رہی ہیں اس بات کی ضرورت ہے کہ درمیانی عرصے کے لیے بھی حالات کو سنوارا جائے۔ ملک جن حالات سے دوچار ہے خصوصیت سے کشمیر میں جو کشت وخون ہو رہا ہے وہ ہمارے اندرونی خلفشار کی بناء پر ہے جس کا فائدہ اٹھا کر ہندوستان نے اپنے مظالم کو انتہا کو پہنچا دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پاکستان کے بارڈر پر جموں اور میر پور میں بھی اور راجستھان میں بھی اس نے اپنی فوجوں کو لگا دیا ہے۔ یہ سارے حقیقی خطرات ہیں۔ آپ ان کی بھی فکر کریں۔

میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کی رہنمائی فرمائے۔ یہ ایوان ان شاء اللہ اسی طرح جس طرح اس نے آج تک آپ کی مدد کی ہے اپنے مشوروں سے، اپنی تنقید سے، اپنے احتساب سے اپنا کردار ادا کرے گا۔ اگر وقتی طور پر دوسرا ایوان نہیں بھی ہو گا تو یہ ایوان ان شاء اللہ اس کمی کو زیادہ سے زیادہ پورا کرنے کی کوشش کرے گا اور پھر مجھے یقین ہے کہ ان شاء اللہ وہ وقت آئے گا کہ جب میں فی الحقیقت کھلے دل سے آپ کو مبارکباد دے سکوں گا کہ ہاں آپ نے حق ادا کر دیا۔ (۱۸ جولائی ۱۹۹۳ء)

– ۲ –

فوجی وردی میں صدارتی انتخاب

۶ اکتوبر ۲۰۰۷ء کو پارلیمنٹ کا اجلاس طلب کر کے صدارتی انتخاب منعقد کیا گیا۔ وکلاء کی تحریک کے پس منظر میں اس انتخاب میں پاکستان سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کی جانب سے جسٹس ریٹائرڈ وجیہہ الدین احمد کو صدارتی امیدوار نامزد کیا گیا جس کی حزبِ اختلاف نے بھی تائید کی۔ جبکہ پیپلز پارٹی کی طرف سے مخدوم امین فہیم اس وقت کے فوجی صدر جنرل مشرف (پاکستان مسلم لیگ ق) کے مقابلے میں صدارتی امیدوار تھے۔ اس الیکشن میں جنرل مشرف بھاری اکثریت سے جیت گئے جبکہ حزبِ اختلاف نے ان انتخابات کا بعض اصولوں کی بنیاد پر بائیکاٹ کیا۔ مرکزی نکتہ یہ تھا کہ پارلیمنٹ بطور الیکٹورل کالج صدر کے انتخاب کے لیے اپنا حق پہلے استعمال کر چکی۔ اب نئے صدارتی انتخاب کے لیے اسمبلی کے نئے انتخابات ہونا ضروری

ہیں۔ دوسرے ایک شخص جو حکومت پاکستان کا تنخواہ دار ملازم (چیف آف آرمی اسٹاف) ہو وہ صدر کے عہدے کے لیے کس طرح امیدوار ہو سکتا ہے۔

زیرِ نظر تقاریر میں ان نکات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

جناب چیئرمین! میرے بھائی قائدِ حزبِ اختلاف، میاں رضا ربانی نے کہا ہے کہ یہ شاید پاکستان کی تاریخ کا اہم ترین اجلاس ہے۔ میں اس میں یہ بھی اضافہ کروں گا کہ یہ ستم ظریفی ہے کہ یہ اہم ترین اجلاس غالباً مختصر ترین اجلاس بھی ہے اور جس طرح ہمیں بلایا گیا ہے، وہ مضحکہ خیز ہے۔ دستور اور قواعد اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ سینیٹ کا اجلاس مناسب نوٹس پر بلایا جائے تاکہ سب لوگوں کو اطلاع ہو اور اگر یہ پتا تھا کہ ۱۶ اکتوبر کو یہ ضرورت پڑنی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہمیں باقاعدہ اطلاع نہیں دی گئی۔ دوسری جانب دستور کے نام پر پس پردہ جو کھیل کھیلے جا رہے ہیں، یہ ملک کی سیاست کو نہایت ہی خطرناک اور نہایت ہی شرمناک سمت کی طرف لے جا رہے ہیں۔

جنابِ والا! اس کے بعد میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ پاکستان میں ہی نہیں دنیا کی تاریخ میں اور جمہوری تاریخ میں یہ پہلا عجوبہ ہو گا کہ ملازمت پر موجود ایک جنرل کو ملک کی صدارت کے لیے امیدوار مانا جائے اور اس کا نام ووٹ کی پرچی پر جنرل کے ساتھ لکھا جائے، اس دستور کے تحت جس میں لکھا ہوا ہے کہ فوج کا کوئی افسر سیاست میں حصہ نہیں لے سکتا۔ وہ دستور جس کے تحت ان کو اپنی بقا کے لیے جو بھی وقت ملا تھا وہ ۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ کو ختم ہو گیا۔ فوجی وردی اتارنے سے متعلق جو اعلان اور جو عہد انہوں نے قوم کے سامنے کیا تھا وہ یہ کہہ کر کیا تھا کہ ایم ایم اے کے ساتھ ہمارے معاہدے کے دس نکات ہیں[1] اور ان دس نکات کی بنیاد پر ایم ایم اے نے ہماری تائید کی۔ معاہدہ کے چھٹے نکتہ کے تناظر میں انھوں نے ۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ء

---

[1] معاہدہ کی تفصیل کے لیے دیکھیے کتاب کا صفحہ نمبر ۱۷

سے پہلے پہلے وردی اتارنے کا وعدہ کیا۔ یہ وعدہ خلافی، دستور کی مخالفت اور اس کی خلاف ورزی ہے۔ وہ اس کے بعد سے قابض صدر تو ہیں لیکن آئینی صدر نہیں ہیں اور اس وقت ان کو بطور صدارتی امیدوار تسلیم کرنا غیر آئینی ہے، یہ غیر قانونی ہے، یہ غیر اخلاقی ہے۔

جنابِ والا! ان تینوں بنیاد پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہماری تاریخ کا تاریک دن ہے، جمہوریت کے لیے یہ ایک المیہ ہے اور اس میں پارلیمنٹ بھی جو کردار ادا کر رہی ہے، وہ اسی نوعیت کا کردار ہے جو اس سے پہلے ۵۹-۱۹۵۸ میں جسٹس منیر نے ادا کیا ہے کہ اس ملک کو جمہوریت کی پٹڑی سے اتار کر آمریت، مداخلت اور باوردی صدر کا راستہ کھول دیا ہے۔ اب بھی وقت ہے، میں تمام اراکینِ پارلیمنٹ کے ضمیر کو یہ دعوت دینا چاہتا ہوں کہ خدا کے لیے سوچیئے کہ آپ کیا کرنے جا رہے ہیں۔ دستور، قانون، سیاست، اخلاق، جمہوریت، ہم ان سب کا دعویٰ کرتے ہیں، جمہوریت اور قانون کی پاسداری کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ہم اس طریقے سے جمہوریت کا قتل کر رہے ہیں۔

جنابِ والا! میں ایم ایم اے اور اے پی ڈی ایم کی طرف سے یہ واضح اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ ہماری نگاہ میں ہر اعتبار سے یہ انتخاب ایک تماشا، ایک ڈھونگ اور ایک ظلم ہے اور ہم ہر سطح پر اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔ ہم نے جسٹس ریٹائرڈ وجیہہ الدین صاحب کو نامزد کیا اور میں ذاتی طور پر بھی اس میں شریک ہوں۔ اس کی صرف ایک وجہ تھی اور میں نے یہ کہہ کر شرکت کی کہ یہ انتخاب نہ جیتنے کے لیے ہے نہ ہارنے کے لیے ہے۔ یہ ہماری قانونی جنگ کا ایک حصہ ہے۔ یہ ہماری جمہوری رسومات کا ایک حصہ ہے۔ ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ کس طریقے سے ملک کے دستور کی خلاف ورزی کی جا رہی ہے۔ ہم نے اس کو واضح کر دیا۔ ہم اپنے مؤقف پر قائم ہیں۔ ہم نے طے کیا ہے کہ ہم اس الیکشن کا بائیکاٹ کریں گے اور اگر یہ نام نہاد ڈرامہ ہو بھی جاتا ہے تو میں یقین سے کہتا ہوں کہ قوم اور ملک اسے کبھی تسلیم نہیں کریں گے۔

اب بھی وقت ہے کہ راستہ بدلیے۔ دستور کے مطابق کام کیجیے۔ جنابِ چیئرمین! جمہوریت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اختیار ایک متعین وقت کے لیے ہوتا ہے۔ رابرٹ رسل

(Robert Russel) نے بڑی اچھی بات لکھی ہے کہ اگر انتخاب تا زندگی ہو جائے تو یہ جمہوریت کی موت ہے۔ جمہوریت کی یہ عام بات ہے کہ اختیار بار بار ملنا چاہیے۔ تین سال، چار سال، پانچ سال مدت متعین کی جاتی ہے اور جب تک کہ نیا اختیار نہ مل جائے اس وقت تک آگے کا کام جمہوری نہیں ہوتا۔ ساتھ یہ بھی کہتا چلوں جنابِ والا! کہ اس ملک میں سینیٹ، قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کی حیثیت انتخابی کالج کی ہے۔ انتخابی کالج کے لیے عوام سے اختیار لیے بغیر نیا صدر مقرر نہیں ہو سکتا۔ امریکہ میں بھی چاہے صدارتی انتخاب میں براہ راست ووٹنگ ہوتی ہو لیکن دراصل وہ اس براہ راست ووٹنگ کے ذریعے سے ایک انتخابی کالج منتخب کرتے ہیں اور انتخابی کالج ہی صدر کا انتخاب کرتا ہے۔ اب بھی وہی صورتحال ہے کہ نئے اختیار کے بغیر انتخابی کالج وجود میں نہیں آیا ہے۔ جو انتخابی کالج پہلے وجود میں آیا ہے وہ نیا صدر منتخب نہیں کر سکتا، یعنی انتخابی کالج موجود ضرور ہے اس کا اختیار باقی نہیں رہا ہے۔

جمہوری اعتبار سے، قانونی اعتبار سے، اخلاقی اعتبار سے، سیاسی اعتبار سے، دستوری اعتبار سے جو ڈھونگ ہم کرنے جا رہے ہیں خدا کے لیے اس سے اجتناب کیجیے اور اس ملک میں جمہوریت کو آنے دیجیے۔ میں APDM اور ایم ایم اے کی طرف سے اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ ہم اس الیکشن کا بائیکاٹ کرتے ہیں۔ اس الیکشن کے نتائج کو قوم تسلیم نہیں کرے گی، پارلیمنٹ تسلیم نہیں کرے گی ہم تسلیم نہیں کریں گے۔ (۱۶ اکتوبر ۲۰۰۷ء)

سپہ سالار خلیفہ کے ماتحت[1]

جناب چیئرمین! میں ذاتی وضاحت کے نکتہ پر اپنے تمام ساتھیوں سے اتنی بات ضرور

---

[1] ۱۷ویں آئینی ترمیم میں حکومت چاہتی تھی کہ چیف آف آرمی سٹاف جنرل پرویز مشرف جو ایک مارشل لاء آرڈر کے تحت اس وقت صدرِ مملکت بھی تھے وہ آئین میں ترمیم کے ذریعے صدر مملکت کے ساتھ ساتھ چیف آف آرمی اسٹاف کا عہدہ بھی اپنے پاس رکھیں۔ حزبِ اختلاف نے حکومت کی اس تجویز کی مخالفت کی۔ اسی حوالے سے پروفیسر خورشید نے خلفائے راشدین کے دور کے واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ سپہ سالار (چیف آف آرمی اسٹاف) خلیفہ (صدر مملکت) کے ماتحت ہوتا ہے اس ضمن میں بحث کے دوران سامنے آنے والی بعض مغالطوں پر پروفیسر خورشید نے جو وضاحت کی وہ یہاں پیش ہے۔

عرض کروں گا کہ جب ہم کسی کی بات کا جواب دے رہے ہوتے ہیں تو ہمیں محتاط ہونا چاہیے۔ ہمارے ایک محترم دوست نے ایک بات کہی جو اوّل تو میں نے کہی ہی نہ تھی نہ ہی وہ صحیح ہے۔ حضور پاک ﷺ اللہ کے رسول بھی تھے، اور وہ خود قانون دینے والے بھی تھے، وہ قاضی القضاۃ اور کمانڈر بھی تھے۔ ان کی مثال نہ ہم نے اس بحث میں شامل کی نہ ہی آپ کو کرنا چاہیے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔

سنت رسول ﷺ کے یہ معنی نہیں ہیں کہ سیاق وسباق کے بغیر سب چیزوں کو ایک جگہ جمع کرلو۔

دوسری بات یہ ہے کہ باقاعدہ فوج حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں بنی ہے اور اس میں حضرت ابو عبیدہؓ کو لشکر کا انچارج بنایا گیا۔ اس وقت سے آج تک یہ روایت موجود رہی ہے۔ سرخسی کی کتاب المقصود میں یہ بات کہی گئی ہے کہ اسلامی نظام کے اندر خلیفہ کے پاس یہ اور یہ شعبے ہوں گے۔ ان شعبوں میں ایک الگ شعبہ فوج کا شعبہ قرار دیا گیا ہے۔ دوسری بات حلال وحرام کے بارے میں کہی گئی جو مناسب نہیں تھی۔ میں ان سے کہنا چاہتا ہوں کہ یہ مسئلہ حلال حرام کا نہیں تھا۔ اس کے باوجود اگر وہ بحث میں یہ رخ لائے ہیں تو ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن پاک میں بشمول خنزیر جن چیزوں کو حرام کہا گیا ہے انسانی جان بچانے کے لیے ان کی بھی ایک حد تک استعمال کی اجازت ہے۔ اور قرآن ہی نے یہ حدود مقرر کر دی ہیں:

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

(البقرۃ ۲:۱۷۳)

ہاں جو شخص مجبوری کی حالت میں ہو اور وہ ان میں سے کوئی چیز کھالے بغیر اس کے کہ وہ قانون شکنی کا ارادہ رکھتا ہو یا ضرورت کی حد سے تجاوز کرے، تو اس پر کچھ گناہ نہیں، اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

قرآن پاک کا یہ حکم دوسری حدود کے بارے میں بھی ہے۔ چنانچہ اگر مجبوراً

۳۱ دسمبر تک کے لیے ایک غلط چیز کو جائز کیا گیا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں:

نہ اس سے آگے بڑھو اور نہ اس کے اندر کوئی مستقل عادت بناؤ۔

یہ اسلام کے حوالے سے جدوجہد ہو گی اور یہ ہماری کوشش ہو گی۔

انہوں نے آج قانونِ ضرورت کا ذکر کیا ہے جس کا حوالہ سپریم کورٹ نے بھی دیا ہے کہ اسلام میں قانونِ ضرورت بھی ایک چیز ہوتی ہے۔ میرے خیال میں یہ بات بھی ریکارڈ پر آنی چاہیے کہ آج انہوں نے قانونِ ضرورت کو تسلیم کیا ہے۔ (۲۹ اکتوبر ۲۰۰۴ء)

– ۳ –

صدارتی حلف اور اس کے تقاضے

[فاروق لغاری کی بطور صدر حلف برداری پر خطاب (۱۹۹۳ء)]

سردار فاروق احمد خان لغاری نے ۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۳ء تک پاکستان سول سروس میں خدمات انجام دیں۔ بعد ازاں اپنے والد سردار محمد خان لغاری کے انتقال پر جب انھیں لغاری قبیلے کا سردار چنا گیا تو انھوں نے سول سروس سے استعفیٰ دے کر سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ ۱۹۷۵ء میں وہ پاکستان پیپلز پارٹی کی جانب سے سینیٹر اور مارچ ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔

۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو جنرل ضیاء الحق کے اقتدار میں آنے کے بعد شروع ہونے والی ایم آر ڈی کی تحریک کے سرگرم رہنما ہونے کے سبب سردار فاروق لغاری کو کچھ عرصہ جیل میں بھی رہنا پڑا۔ ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں بھی جناب فاروق لغاری نے ڈیرہ غازی خان سے قومی اسمبلی میں کامیابی حاصل کی۔ ۹۳–۱۹۹۰ء کے دوران انھوں نے قومی اسمبلی میں بطور ڈپٹی اپوزیشن لیڈر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ ۱۹۹۳ء میں سردار بلخ شیر مزاری کی نگران حکومت میں وہ وزیرِ خزانہ رہے۔ بعد ازاں ۱۳ نومبر ۱۹۹۳ء کو پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت نے انھیں صدر پاکستان کے عہدہ پر منتخب کرایا۔ زیرِ نظر تقریر ان کی حلف برداری کے بعد کی گئی ہے۔

محترمہ چیئرپرسن صاحبہ[1]! میں بھی اس اہم موقع پر اپنے سینیٹر بھائیوں کی طرح نئے منتخب صدر جناب فاروق احمد خان لغاری کو اس عظیم ذمہ داری کے اٹھانے پر مبارک باد دیتا ہوں۔ ساتھ ہی ان کے لیے استقامت اور دین و ملک دونوں کی خلوص سے خدمت کے لیے دعا بھی کرتا ہوں۔ میں اصل موضوع پر اپنے جذبات کا اظہار کرنے سے پہلے ایجنڈے اور بحث کے طریقۂ کار کے معاملے کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

سینیٹ میں الحمدللہ گذشتہ آٹھ سالوں کے دوران میں نے بڑے کھلے دل کے ساتھ حکومت اور حزبِ اختلاف دونوں کے حقوق کا خیال رکھتے ہوئے اپنا کردار ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے دکھ ہے کہ اس موضوع پر گفتگو کے لیے جو طریقہ اختیار کیا گیا وہ مناسب نہیں تھا[2]۔ ہمارے وزیرِ پارلیمانی امور ان لوگوں میں سے ہیں جنھیں ایوان کی روایات کے بارے میں علم ہے کہ جب بھی معمول سے ہٹ کر اس نوعیت کی کوئی بات ہو تو حکومت کی پارٹی اور حزبِ اختلاف کے لوگ ہمیشہ آپس میں مشورہ کرکے طے کر لیا کرتے ہیں کہ خوش اسلوبی کے ساتھ متنازعہ معاملات کو ایوان میں کس طرح زیرِ بحث لایا جائے۔ ماضی میں ہم نے یہی کیا ہے اور آئندہ بھی ہم چاہتے ہیں کہ یہی ہو۔ ہم میں سے ہر ممبر اور پارٹی کے لیے بھی اور اس ایوان کے وقار کے لیے بھی یہی بہتر ہے۔

طریقۂ کار کے بارے میں یہ بات کہنے کے بعد اب میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ میں یہ بات صاف طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ سیاست میں اختلاف، نہ کوئی بری بات ہے،

---

[1] چیئرمین سینیٹ اس وقت جناب وسیم سجاد تھے البتہ سیشن کے دوران ڈپٹی چیئرپرسن سینیٹ ڈاکٹر نور جہاں پانیزئی اجلاس کی صدارت کر رہی تھیں۔

[2] نو منتخب صدر پاکستان سردار فاروق احمد لغاری کو مبارکباد دینے کے لیے وزیر پارلیمانی امور جناب شیر افگن نے پہلے سے طے شدہ ایجنڈے سے ہٹ کر اچانک اسپیکر سے مبارک باد دینے کے لیے قرار داد پیش کرنے کی اجازت چاہی جس پر بعض ارکان نے طے شدہ ایجنڈے سے ہٹ کر مبارکباد کا سلسلہ شروع کرنے پر اعتراض کیا۔ دوسرے روز قائدِ حزبِ اختلاف جناب محمد علی خان ہوتی نے یہ اعتراض کر دیا کہ سینیٹ کے پاس اور کام بہت ہیں۔ سینیٹ مبارکبادیں دینے کے لیے نہیں ہے۔ اس کے باوجود جناب محمد علی خان ہوتی نے خود بھی صدرِ مملکت کو مبارکباد پیش کی۔ پروفیسر خورشید احمد نے اپنی تقریر میں اسی جانب اشارہ کیا ہے۔

نہ کوئی جرم یا کوئی گناہ ہے۔ سیاست اور جمہوریت نام ہی اس بات کا ہے کہ اختلافات ہوں۔ مذاکرات ہوں، بحث و گفتگو ہو، دلائل دیے جائیں اور اس طرح مباحثہ کے بعد بہترین پالیسیاں تشکیل دی جا سکیں۔ درحقیقت قوم نے بھی اپنے نمائندوں کا انتخاب اسی تناظر میں کرنا ہوتا ہے۔ اس پہلو سے میں سمجھتا ہوں کہ اس ضمن میں مثبت پیش رفت ہوئی ہے۔ یہ بڑی مبارک بات ہے کہ ملک میں سیاسی عمل جاری ہے اور جمہوری اداروں اور انتخابی عمل کے ذریعے قیادت، خواہ وہ صوبائی سطح کی ہو یا مرکز کی سطح کی اور یا صدارت کا مقام ہو، اسی سیاسی عمل کی بنیاد پر ہو رہی ہے۔ یوں یہ ایک بڑی مبارک گھڑی اور بڑا اہم پراسیس ہے۔ اس میں ہم سب نے، وہ بھی جو برسر اقتدار آئے ہیں اور وہ بھی جو حزبِ اختلاف میں ہیں اسی طرح بڑی جماعتیں بھی اور چھوٹی جماعتیں اور افراد بھی، سب نے اپنا اپنا کردار ادا کیا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ اس موقع پر یہ بات سب کے سامنے رہے کہ اس ملک میں اصل فتح اور کامیابی اداروں کو اور سیاسی روایات کو مستحکم کرنے سے جڑی ہوئی ہے۔ سیاسی عمل اور الیکشن کے عمل کو مستحکم کرنے میں اس کامیابی پر فی الحقیقت یہ تمام قوم قابلِ مبارک باد ہے۔ انتقال اقتدار جمہوری بنیاد پر لوگوں کے ووٹ کے ذریعے سے ہوا ہے اور صدارت میں تبدیلی بھی ووٹ کے ذریعے سے اور دستور کے مطابق ہوئی ہے۔ یہ چیز فی الحقیقت ہمارے لیے قابلِ فخر ہے اور ہمیں اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ جناب فاروق لغاری کو میں اسی بنا پر مبارک باد دیتا ہوں کہ وہ دستور کے تحت اپنے الیکٹورل کالج کے ذریعے منتخب ہوئے ہیں اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان اداروں نے ان کو اپنے اعتماد کے لائق سمجھا۔ میں انہیں دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں اور یہ توقع رکھتا ہوں کہ جو حلف آج انہوں نے اٹھایا ہے وہ اس کی پاسداری کریں گے۔

درحقیقت حلف محض کوئی سجاوٹ کی چیز نہیں ہے۔ یہ اللہ اور اس ملک کے عوام کے ساتھ ایک عہد ہے۔ اپنے حلف میں جس ذمہ داری کو انہوں نے قبول کیا ہے ان میں سب سے پہلی چیز اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ وفاداری ہے۔ اللہ کے احکام کو ماننا اور جو

اختیار، جو موقع، جو قوت اور جو صلاحیت اللہ نے ان کو دی ہے اس کے بارے میں یہ عہد ہے کہ وہ اس وفاداری کے تقاضوں کو پورا کرنے میں استعمال کریں گے۔

دوسرا عہد انہوں نے پاکستان کے استحکام، اس کی آزادی اور سالمیت کی حفاظت، دستور کی حفاظت اور اس کے مطابق عمل کرنے کا کیا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ان کو اس عہد کو پورا کرنے کی توفیق بخشے۔ ہماری دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔ میں یہ بات صاف طور پر اپنی جانب سے بھی اور اپنی پارٹی کی جانب سے بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ہر وہ چیز جو وہ یا برسرِ اقتدار پارٹی اور حکومت، دین، قوم اور ملک کے بہترین مفاد میں اور دستور کے مطابق کریں گے، ہم اپوزیشن میں ہوتے ہوئے بھی اس کی تائید کرنے میں کبھی کوئی عار محسوس نہیں کریں گے اور ہر وہ چیز جو ان روایات کے مطابق صحیح نہیں ہے تو ان شاء اللہ اس کے اوپر ہم بھرپور احتجاج کریں گے۔ یہی وہ اصول ہے جو قرآن نے ہمیں سکھایا ہے کہ:

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (سورۃ المائدۃ ۵:۲)

جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔ اور اللہ سے ڈرو، اس کی سزا بہت سخت ہے۔

ان شاء اللہ اس اصول پر ہم پورے طریقے سے عمل کریں گے۔ ہم توقع رکھتے ہیں کہ محض حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کے انداز میں نہیں بلکہ اس ملک اور امتِ مسلمہ کے بہترین مفاد کو سامنے رکھ کر معاملات کو طے کیا جائے گا۔ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ جہاں تک فاروق لغاری صاحب کی ذات کا تعلق ہے۔ مجھے ان سے تقریباً ۲۰ سال سے ذاتی تعلق رکھنے کا موقع ملا ہے۔ میں نے ان کو اس وقت بھی دیکھا جب وہ آکسفورڈ میں زیر تعلیم تھے اور انھوں نے میرے متعدد پروگراموں میں شرکت کی۔ بعد ازاں ملک میں بھی مجھے ان سے ملنے کا موقع ملا۔ بہت سے مواقع پر مختلف معاملات میں ہماری آراء میں اختلاف اور اتفاق رہا۔ دونوں طرح کے مواقع پر میں نے ان کو ایک شریف اور جلیل القدر اعلیٰ انسان اور ایک

اچھا مسلمان پایا ہے۔ اس پہلو سے ہم ان سے اچھی توقعات رکھتے ہیں اور اس بات کو اس ملک کے لیے فال نیک سمجھتے ہیں کہ وہ ایک شریف اور نیک نام انسان ہیں اور سیاسی اور عملی دونوں اعتبار سے اچھے بیک گراؤنڈ اور اچھی شہرت کے حامل ہیں۔

میں اس موقع پر یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے چیئرمین سینیٹ وسیم سجاد صاحب نے قائم مقام صدر کی حیثیت سے جس دیانتداری، سمجھ بوجھ اور اعلیٰ صلاحیت کے ساتھ گذشتہ چار مہینوں میں اپنی قومی اور دستوری ذمہ داریوں کو پورا کیا ہے اور اس زمانے میں جس سادگی اور جس کھلے ذہن کا مظاہرہ کیا ہے ہم سب اس سے متاثر ہیں۔ سیاست میں فتح اور شکست ایک عارضی چیز ہوتی ہے لیکن انہوں نے اپنے کردار اور اپنے مقام سے ہمارے دلوں کو موہ لیا ہے۔ اس سے ان کی عزت و وقار بڑھا ہے اور یہ بات کہ انہوں نے اس پورے زمانے میں ایوانِ صدر منتقل ہونے کی بجائے اپنے اسی گھر میں رہ کر صدارت کی ذمہ داری ادا کی ہے جہاں وہ اس سے پہلے رہ رہے تھے ان مثالوں میں سے ہے جنہیں ہمیں اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔ جو اچھی روایات ہماری یہ قیادت قائم کر رہی ہے میں اس پر ان کو ہدیہ تبریک اور بہترین دعاؤں کا تحفہ پیش کرتا ہوں اور یہ دعا کرتا ہوں کہ جس طرح ماضی میں انہوں نے ملک کی خدمت کی ہے آئندہ بھی انہیں بیش از بیش خدمت کے مواقع ملیں۔

ان الفاظ کے ساتھ ایک بار پھر فاروق لغاری صاحب کو مبارک باد دیتے ہوئے اس توقع کا اظہار کرتا ہوں کہ جس طرح انہوں نے خود بھی کہا ہے وہ اب ایک پارٹی کے صدر نہیں بلکہ اس ملک کے صدر ہوں گے اور اس حیثیت سے ملک کی تمام پارٹیوں اور تمام مکاتبِ فکر کے ساتھ وہ کھلے دل کے ساتھ معاملات کریں گے۔ انہوں نے انتخاب سے پہلے بھی یہ اہم فقرہ ادا کیا تھا کہ میں منتخب ہو گیا تو میں محض فضل الٰہی نہیں ہوں گا[1] [بلکہ] دستور

---

[1] اشارہ ہے: سابق صدر چوہدری فضل الٰہی کی جانب، جو قبل ازیں پیپلز پارٹی کے بانی جناب ذوالفقار علی بھٹو کی وزارت عظمیٰ کے دوران صدر پاکستان تھے۔ اپنے پورے دورِ صدارت میں آئین کے مطابق اپنے منصبی مقام کا لحاظ کرنے کی بجائے ان کا طرز عمل وزیر اعظم کے ماتحت کا سا رہا۔

کے مطابق جو مقام صدر کا ہے اس کے مطابق اپنے فرائض ادا کروں گا۔ میں توقع رکھتا ہوں کہ وہ اس معاملے میں ایک اعلیٰ مثال قائم کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہماری دعائیں ان کے ساتھ ہیں اور ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ پارلیمنٹ، جو صدر، سینیٹ اور قومی اسمبلی پر مشتمل ہے، اس ملک کی تعمیر میں اور ملک کے معاشی، اخلاقی اور قانونی مسائل کو حل کرنے میں مثبت کردار ادا کرے گی۔ قوم کی جو توقعات ہم سے وابستہ ہیں ہم ان شاء اللہ انہیں پورا کریں گے۔

میں یہ بات صاف کہنا چاہتا ہوں کہ اس الیکشن کے موقع پر ہر قدم پر ہمیں اس بات کا تجربہ ہوا ہے کہ پاکستان کے عوام احتساب اور انتخاب کے بارے میں بہت اچھا شعور رکھتے ہیں۔ انہوں نے ہر موقع پر یہ پوچھا کہ یہ بتایئے کہ اس سے پہلے قومی اسمبلیاں کیا کرتی رہی ہیں۔ کیا قانون سازیاں آپ نے کی ہیں۔ ہمارے مسائل آپ نے کہاں تک حل کیے ہیں۔ اپنی نمائندگی کے دعویداروں کو انھوں نے یاد دلایا ہے کہ صرف الیکشن کی وجہ سے وہ آپ کی شکل دیکھ رہے ہیں۔

یہ ساری باتیں ہم سے اس بات کا مطالبہ کرتی ہیں کہ پارلیمنٹ آئندہ اپنی خدمت کے ذریعے سے اپنے وقار کو بلند کرے۔ پاکستان کے حقیقی مسائل پر توجہ دے اور جو توقعات اس قوم نے ہم سے کی ہیں انہیں پورا کرنے کی کوشش کرے۔ ان گزارشات کے ساتھ میں ایک بار پھر نومنتخب صدر کو مبارک باد دیتا ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ وہ ان شاء اللہ اپنی ذمہ داریاں پوری کریں گے اور یہ ایوان اپنا کردار مؤثر انداز میں ادا کرے گا۔

(۱۴نومبر ۱۹۹۳ء)

۱۷ویں آئینی ترمیم کے موقع پر
ایم ایم اے اور حکومتی مذاکراتی ٹیم کے درمیان سماجی معاہدہ

دونوں مذاکراتی ٹیمیں درج ذیل معاہدے پر رضامند ہوئیں جس پر پاکستان مسلم لیگ (ق) کی جانب سے چوہدری شجاعت حسین اور جناب ایس ایم ظفر نے اور ایم ایم اے کی جانب سے مولانا فضل الرحمٰن، لیاقت بلوچ اور حافظ حسین احمد نے دستخط کیے۔

۱۔ آئینی ترمیم کے نتیجے میں صدر کو قومی اسمبلی کو تحلیل کرنے کا اختیار حاصل ہو گا بشرطیکہ سپریم کورٹ آف پاکستان ان کے فیصلے کی توثیق کر دے۔

۲۔ اس آئینی ترمیم میں قومی سلامتی کونسل کو کوئی تحفظ نہیں دیا جائے گا لیکن وہ ایک علیٰحدہ قانون کے ذریعے قائم کی جاسکتی ہے۔

۳۔ صدرِ مملکت اپنی صوابدید کے بجائے آرٹیکل ۲۴۳ کے تحت وزیر اعظم کے مشورے سے اپنے اختیارات استعمال کریں گے۔

۴۔ چھٹے شیڈول کے آئٹم نمبرے ۲، ۳۰، اور ۳۵ جن کے ذریعے صوبائی اسمبلیوں کا لوکل باڈیز آرڈیننس اور پولیس آرڈر میں ترمیم کا اختیار محدود کر دیا گیا ہے، آئینی ترمیم کی تاریخ سے چھ سال گزرنے کے بعد یہ پابندی خود بخود ختم ہو جائے گی۔

۵۔ اعلیٰ عدلیہ کے ججوں کی ریٹائرمنٹ کی عمر جیسا کہ دستور میں موجود ہے برقرار رکھی جائے گی۔

۶۔ آرٹیکل ۶۳(۱)(ڈی)۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ء کو قابل عمل ہو جائے گا۔ آرٹیکل صدرِ مملکت کو دو عہدے رکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔

۷۔ آئین میں ایک ترمیم کی جائے گی جس کے نتیجے میں صدر موجودہ الیکٹورل کالج سے اعتماد کا ووٹ لے سکیں گے۔ اس سلسلے میں آٹھویں ترمیم والا طریقہ اختیار کیا جائے گا۔

۸۔ ایل ایف او پارلیمنٹ میں دو تہائی اکثریت سے پاس کیا جائے گا۔ ۱۷ویں ترمیم اور اس کے متعلقات وغیرہ۔

۹۔ صدرِ مملکت کی جاری مدت اقتدار کو قانونی حیثیت دینے کے لیے ایم ایم اے ترمیم کی حمایت کرے گی۔ ایم ایم اے کے اراکین پارلیمنٹ میں صدر کی حمایت کے پابند نہیں ہونگے لیکن وہ صدر کے خلاف اپنے ووٹ استعمال نہیں کریں گے۔ ایم ایم اے کے اراکین پارلیمنٹ میں موجود رہیں گے اور کوئی احتجاج نہیں ہو گا۔

۱۰۔ معاہدے کے مطابق دونوں جماعتیں آئینی ترمیم تیار کرنے اور اسے پارلیمنٹ سے دو تہائی اکثریت سے منظور کرانے کی پابند ہوں گی۔

(بحوالہ: 17th Constitutional Amendment & Its Aftermath: The Role of Muttahidda Majlis-i-Amal (MMA) by Kamran Aziz Khan, Journal of Pakistan Vision, Published by Pakistan Study Centre, Punjab University, Lahore)

باب نمبر ۲

قائدِ ایوان، سینیٹ چیئرمین اور ڈپٹی چیئرمین کے مناصب کا انتخاب

- ۱ -

پارلیمانی جمہوریت کا حسن یہ ہے کہ اس میں اکثریتی پارٹی جب حکومت میں ہوتی ہے تو حزبِ اختلاف کو مستقبل کی حکمراں جماعت کا درجہ دیا جاتا ہے اسی سبب تمام قومی معاملات میں حکمراں جماعت حزبِ اختلاف کو اعتماد میں لیتی ہے اور ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کرتی ہے۔ اختلافِ رائے کے باوجود باہمی ذاتی تعلقات خوش گوار رہتے ہیں۔ اختلاف کو ملکی معاملات میں ترجیحات، علم، طبائع اور رائے کا اختلاف سمجھا جاتا ہے۔ آپس کے مقابلوں میں کامیابی پر ایک دوسرے کو مبارک بادیں دینا ایک روایت ہی نہیں ایک موقع بھی ہوتا ہے کہ قومی امور میں باہم تعاون اور ہم آہنگی کے لیے ساز گار ماحول پیدا کیا جائے۔ پروفیسر خورشید احمد نے بطور سینئر سیاستدان ہمیشہ بہت خوبصورتی سے اس کا اہتمام کیا۔ زیرِ نظر تقاریر ایسے ہی مواقع کی ہیں۔ پہلی تقریر اس موقع کی ہے جب پیپلز پارٹی کے رہنما رضا ربانی نے ۲۰۰۸ء میں سینیٹ میں قائد ایوان کا منصب سنبھالا۔ دوسری تقریر اس کے چند ماہ بعد مارچ ۲۰۰۹ء کی ہے جب جناب فاروق نائیک نے سینیٹ کے چیئرمین اور جان محمد جمالی نے سینیٹ کے ڈپٹی چیئرمین کا منصب سنبھالا۔

جناب چیئرمین! میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے، ہماری تاریخ کے ایک خاص لمحے میں اور سینیٹ میں ایک حد تک ایک نئی روایت کے قائم ہونے کے وقت اپنی رائے کے اظہار کا موقع دیا۔ مجھے اس ایوان میں ۱۹۸۵ء سے شرکت کا شرف حاصل

ہے۔ تاہم یہ پہلا موقع ہے کہ قائدِ ایوان اور قائدِ حزبِ اختلاف کے اس طرح منتخب اور مقرر ہونے پر ایوان اپنے جذبات کا اظہار کر رہا ہے۔ میں سب سے پہلے اپنے بھائی میاں رضا ربانی کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ وہ اس اعزاز کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ ہم نے ان کے ساتھ گزشتہ کئی سال کام کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ مختلف پارٹیوں سے وابستہ ہونے اور نظریات اور ترجیحات میں اختلاف ہونے کے باوجود جس تعاونِ باہمی اور محبت و یگانگت اور جس فراخدلی اور خوش اسلوبی سے انہوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ معاملہ کیا ہے اس نے ہمارے دلوں میں ان کے لیے ایک بڑا ہی اہم مقام پیدا کر دیا ہے۔ انہوں نے ہمارے دلوں میں گہری جگہ بنائی ہے۔ اسے ہم محسوس کرتے ہیں اور مجھے توقع ہے کہ اپنی نئی ذمہ داریوں میں بھی وہ اپنی شخصیت کے اسی پہلو کو نمایاں رکھیں گے اور اس طرح یہ ایوان کچھ نئی اور زیادہ بہتر روایات کی طرف بڑھے گا۔

میں اس موقع پر اپنے عزیز بھائی کامل علی آغا کو بھی اپوزیشن لیڈر مقرر ہونے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ ان کے ساتھ بھی کام کی اچھی روایات قائم ہوئی ہیں۔ اس کی طرف میاں رضا ربانی نے بھی اشارہ کیا اور میں ان کی تائید کرتا ہوں۔ مجھے توقع ہے کہ ان شاءاللہ اب وہ اس سے زیادہ کام کر کے بحیثیت لیڈر آف دی اپوزیشن اس ایوان کو اور اس کے مقام و کارکردگی کو چار چاند لگانے کا ذریعہ بنیں گے۔

اپوزیشن کے ساتھ تعلق: جناب چیئرمین! میں اس موقع پر یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ گو میں اور میرے دوسرے ساتھی، جس میں ایم ایم اے کے پانچ ارکان، پختونخوا ملّی پارٹی کے تین ساتھی اور پاکستان نیشنل پارٹی کے ڈاکٹر عبد المالک شامل ہیں، بحیثیت ایک آزاد گروپ اپوزیشن کا حصہ ہیں۔ لیکن میں واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ہم اپوزیشن میں ضرور ہیں، مگر اپوزیشن کے بڑے گروپ کا حصہ نہیں۔ ہم اپنا منفرد کردار ادا کریں گے۔ ہم ممنون ہیں کہ آپ نے اور لیڈر آف دی ہاؤس اور لیڈر آف دی اپوزیشن نے ہمارے آزاد کردار کو تسلیم کر لیا ہے۔ اس طرح پی ایم ایل (ق) اور ان کے اتحادیوں کی اپوزیشن کے ساتھ ساتھ ہم بحیثیت آزاد حزبِ اختلاف

اپنا کردار ادا کریں گے۔ یہ روایات دنیا کی مختلف پارلیمان میں موجود ہیں کہ آزاد حزبِ اختلاف گروپ اور بڑا حزبِ اختلاف گروپ ایوان کے اس پار ساتھ بیٹھنے کے باوجود اپنا منفرد اور متعین کردار ادا کرتے ہیں۔ ہم ان شاء اللہ اپنی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے بحیثیت اپوزیشن اپنا کردار ادا کریں گے۔ یہاں ایک دلچسپ حقیقت بھی ہمارے سامنے ہے کہ پیپلز پارٹی اور اس کے اتحادی کل تک یہاں ہمارے ساتھ اپوزیشن میں اور پی ایم ایل (ق) اور اس کے حلیف ایوان کی دوسری جانب تھے۔ اب وہ اِدھر آ گئے ہیں، یہ اُدھر چلے گئے ہیں۔ ایک شعر ذہن میں آتا ہے۔ ؎

وہی کارواں وہی راستے وہی زندگی وہی مرحلے
لیکن اپنے اپنے مقام پر کبھی تم نہیں، کبھی ہم نہیں

لیکن میں عرض کروں گا کہ ہم میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اس مقام پر ہیں جہاں پہلے تھے اور اس طرح ہم حقیقی اور حقیقی حزبِ اختلاف ہیں اور ان شاء اللہ ہم یہ کردار ادا کریں گے۔

اپوزیشن کا کردار: جنابِ والا! اس کے ساتھ ہی میں آپ سے یہ کہنے کی اجازت چاہوں گا کہ اس وقت ملک ایک بڑے ہی نازک دور سے گزر رہا ہے جب پیپلز پارٹی اقتدار میں آئی تو سینیٹ میں اس کی اکثریت نہیں تھی لیکن ان کو یاد ہو گا کہ ہم نے پوری کوشش کی کہ حکومتی پارٹی کے اقلیت میں ہونے کے باوجود اس ایوان کی کاروائی میں کوئی رخنہ نہ پڑنے پائے، کوئی خلل واقع نہ ہو۔ چنانچہ ہر وہ معاملہ، خاص طور سے قانون سازی، جس میں اکثریت کی ضرورت ہوتی ہے، ہم نے پوری کوشش کی کہ اس میں ان کے ساتھ تعاون کریں۔ میں آج بھی کم از کم اپنی اور اپنے ساتھیوں کی طرف سے یہ یقین دہانی کرانا چاہتا ہوں کہ ہم اپوزیشن میں ہیں لیکن دل کی گہرائیوں سے چاہتے ہیں کہ موجودہ حکومت اور اس کا اتحاد باقی رہے، کامیاب ہو اور ملک اس دلدل سے نکلے جس میں وہ پھنسا ہوا ہے۔

جنابِ والا! کسی بھی معاملہ میں حمایت یا مخالفت پارٹیوں کا مسئلہ نہیں ہے۔ درحقیقت یہ قوم اور ملک کے مستقبل کا مسئلہ ہے۔ اس اعتبار سے میں یقین دلاتا ہوں کہ قانون سازی، پالیسی سازی اور کسی بھی دوسرے معاملے میں ہم جس چیز کو صحیح سمجھیں گے، ان شاء اللہ

اس میں ان کا بھرپور ساتھ دیں گے۔ محض یہ بات کہ ہم اپوزیشن میں ہیں، تعاون میں کسی پہلو سے بھی مانع نہیں ہو گی۔ ہاں، جہاں ہم ان سے اتفاق نہیں کریں گے، وہاں ہم دلیل کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کریں گے اور یہ توقع رکھیں گے کہ وہ بھی کھلے دل سے دلائل کی بنیاد پر ہماری بات کو سنیں گے اور، جیسا کہ پارلیمانی روایات ہیں، کوئی نہ کوئی بیچ کا راستہ، اتفاق رائے سے نکالنے کی کوشش کریں گے۔ یہی وہ طرز عمل ہے جس سے ہم جمہوریت کی طرف پیش قدمی کر سکتے ہیں۔

اداروں کی بحالی: جنابِ والا! میں اس وقت یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اس وقت سب سے بڑا مسئلہ اس ملک میں اداروں کی بحالی، مضبوطی اور دستور کے اصل ڈھانچے کے مطابق ان کا متحرک اور مؤثر ہونا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی چیز عدلیہ کا ۲ نومبر ۲۰۰۷ء کی پوزیشن میں بحال ہونا ہے[1]۔ درحقیقت اس وقت ہم سب عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہیں، اس معاملے میں کسی قسم کی تاخیر پورے عمل کو متاثر کر سکتی ہے۔ اس تناظر میں، میں پورے اخلاص اور دیانتداری کے ساتھ حکومت، حکومت کی تمام پارٹیوں اور اپوزیشن کے تمام ساتھیوں سے یہ درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ تمام معاملات کو بھول کر سب سے پہلے عدل کے نظام کو اس کی صحیح شکل میں لائیے۔

جنابِ والا! میں واضح کرنا چاہتا ہوں کہ عدلیہ کی آزادی اور ججوں کی بحالی یہ دو مختلف چیزیں نہیں ہیں۔ اس لیے کہ اگر ججوں کو سرسری طور پر ایک شخص ہنگامی حالت کا نام لے کر رخصت کر سکتا ہے، ان کو ان کے گھروں میں محبوس کر سکتا ہے اور کچھ دوسروں سے اپنے خود ساختہ پی سی او کی وفاداری کا نیا حلف لے کر عدالت پر ان کو مسلط کر سکتا ہے تو یہ آزاد

---

[1] صدر جنرل پرویز مشرف نے ۳ نومبر ۲۰۰۷ء کو ملک میں ایمرجنسی نافذ کر کے چیف جسٹس آف پاکستان کو سبکدوش کر دیا تھا اور اعلیٰ عدلیہ کے ججوں سے کہا گیا تھا کہ وہ عبوری آئینی حکم (PCO) کے تحت حلف لیں جس پر ججوں کی اکثریت نے حلف لینے سے انکار کر دیا تھا۔ بعد ازاں ملک بھر میں عدلیہ کی بحالی کی ایک عوامی تحریک چلی۔ نتیجتاً تمام سیاسی جماعتوں نے ۲۰۰۸ء کے الیکشن میں کامیابی پر عدلیہ کو ۲ نومبر ۲۰۰۷ء کی پوزیشن پر بحال کرنے کا وعدہ کیا تھا، پروفیسر خورشید نے اپنی تقریر میں اس کا حوالہ دیا ہے۔

عدلیہ کی صفت نہیں ہے۔ یہ ایک خاص شخص کی مرضی کی اور محبوس عدلیہ ہوگی جس کو دنیا میں کسی بھی اعتبار سے قابلِ اعتماد عدلیہ نہیں کہا جاسکتا۔ انصاف کے لیے ضروری ہے کہ اپنے عہدوں سے غیر قانونی طور پر ہٹائے جانے والے جج جس مقام پر تھے، اس پر دوبارہ آئیں اور عدلیہ اپنی اصل ۲ نومبر ۲۰۰۷ء کی صورت میں بحال ہو۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر انہیں پورا موقع دیا جائے تو یہ جج انصاف کریں گے۔ جو کچھ بھی ان کے ساتھ ہوا ہے وہ اسے معاف کر دیں گے اور اس ملک کے دستور کے تحت انصاف کی فراہمی کو اوّلیت دیں گے لیکن یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کو اس مقام پر بحال کریں۔

دستور کی اصل شکل میں بحالی: جنابِ والا! پھر اگلا مسئلہ یہ ہے کہ دستور کو اصل شکل میں بحال کیا جائے۔ دستور کو جس طرح سے قطع و برید کیا گیا ہے اور خصوصیت سے تین نومبر کی ایمرجنسی جس طرح لگائی گئی ہے وہ فوری طور پر قابلِ توجہ ہے۔ یہ فی الحقیقت مارشل لاء کی ایک شکل تھی اور ہے۔ خود جنرل پرویز مشرف نے اسے ایک ماورائے آئین اقدام کہا تھا۔ اس کی مکمل طور پر نفی کی جائے۔ ضروری ہے کہ پارلیمنٹ برملا اظہار کرے کہ وہ اقدام بالائے دستور تھا۔ کسی کو اختیار نہیں ہے کہ وہ دستور کو اس طرح معطل کرے۔ پارلیمنٹ کے علاوہ کسی کو اختیار نہیں ہے کہ دستور میں ترمیم کرے اور کسی کو اختیار نہیں ہے کہ کسی فرد کو دستوری ترمیم کرنے کا اختیار دے یا غیر دستوری اقدام کی توثیق کرے۔ جنابِ والا! یہ بڑا بنیادی مسئلہ ہے اور یہ ملک آج تک اس لیے نقصان اٹھا رہا ہے کہ پارلیمنٹ نے بار بار غاصبوں کو تحفظ دیا اور ان کے اقدامات کی توثیق کی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ غاصب کو غاصب اور ظالم کو ظالم کہا جائے۔ دستور توڑنے والے کو اس کا مجرم قرار دیا جائے اور پارلیمنٹ کسی شکل میں بھی اس کے غیر آئینی اقدامات کی توثیق نہ کرے۔

آئینی انحراف کے دوران ہونے والے کاموں کی توثیق: جنابِ والا! یہاں میں یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں اور یہ ایک بڑا سنجیدہ مسئلہ ہے جس پر میں خاص طور پر وزیرِ قانون کو متوجہ کروں گا۔ اس سے پہلے جب بھی دستوری انحراف ہوا اور اس انحراف کے دور میں جو کچھ بھی کیا گیا،

پارلیمنٹ کے وجود میں آنے کے بعد پہلا کام یہ ہوا ہے کہ اس دور کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا جائے۔ کیا غلط تھا؟ کیا صحیح تھا؟ کس چیز کی توثیق کی جارہی ہے؟ کس کی توثیق نہیں کی جارہی ہے؟ آرٹیکل ۲۶۹، ۲۷۰(اے)، ۲۷۰۔اے(اے) اس کے مظہر ہیں۔ دستوری انحراف اور اس عبوری دور کو ختم کرنے اور دوبارہ آئین کی پیروی کی طرف ملک کو لے آنے کے لیے یہ قدم اٹھانا ضروری ہے۔

لیکن جنابِ والا! میں پریشان ہوں کہ قومی اسمبلی کے دو یا تین اجلاس ہو چکے ہیں، ہم اور بہت سے کام کر رہے ہیں لیکن کچھ واضح نہیں کہ اس کی بنیاد کیا ہے۔ کیا آج بھی آئینی انحراف جاری ہے؟ اگر نہیں ہے اور میری نگاہ میں نہیں ہے تو اس کے لیے اسمبلی کی ذمہ داری تھی کہ وہ پہلا کام یہ کرے کہ ہم دستور کی معطلی کے دوران کیے جانے والے اقدامات کی توثیق نہیں کرتے البتہ جو اقدام کیے جا چکے ہیں، ان کو کور کرنے کے لیے یہ اور یہ راستہ اختیار کرتے ہیں۔ لیکن یہ کام اب تک نہیں کیا گیا ہے۔ میری نگاہ میں یہ جو دستور کا المیہ ہے، اس سے نکلنا بہت ضروری ہے۔

مجھے آپ کی مشکلات کا اندازہ ہے۔ خاص طور پر اس پہلو سے کہ کچھ چیزوں کے لیے دونوں ایوانوں میں دو تہائی اکثریت ضروری ہے لیکن یہ کام بہر حال ناگزیر ہے اور یہ ہو جانا چاہیے کہ پارلیمنٹ اس بات کا اعلان کرے کہ ۳ نومبر کا اقدام غیر قانونی اور غیر آئینی تھا، جسے معاف نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ اس اقدام کے جو قانونی اثرات ہیں اور اس زمانے میں جو کام ہوئے ان میں سے جن جن کو تحفظ ملنا چاہیے اس پر بہر حال پارلیمنٹ کو فیصلہ ضرور کرنا چاہیے۔ تاہم مکمل توثیق جس کی روایت ماضی میں ۲۷۰۔اے اور ۲۷۰۔اے(اے) کے ذریعے قائم کی گئی ہے اسے ختم ہونا چاہیے۔ جناب والا! یہ بہت اہم مسئلہ ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اس وقت میری نگاہ میں مسائل کے دو بڑے بڑے گروپ ہیں۔ پہلا وہ ہے کہ جو غیر آئینی اقدام سے متعلق ہے اور ان میں عدلیہ اور دستور کا معاملہ اور کچھ دیگر چیزیں ہیں یعنی تین نومبر کا اعلان بھی اور اس کی revocation

بھی، میری نگاہ میں غیر قانونی ہیں۔ ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے لیکن گاڑی کو پٹڑی پر لانے کے لیے ہمیں اس کا سامنا کرنے پڑے گا۔ تیز رفتاری سے آگے بڑھنے کا کام اسی وقت ہو گا جب گاڑی پٹڑی پر ہو اور پٹڑی پر لانے کے لیے دونوں کام، عدلیہ کی بحالی اور جو آئینی انحراف ہوئے ہیں اور جو دستور میں قطع و برید ہوا ہے، اس کو ختم کرنا ضروری ہے تب ہی ملک دوبارہ آئین کی پیروی کے راستے پر آسکے گا۔ اس کے بعد پھر دوسرے مسائل ہیں جن پر فوری توجہ ضروری ہے۔ ان میں آٹے، توانائی، گیس، تجارت کا خسارہ، مالیاتی خسارہ اور یہ جو ہماری خود مختاری کی خلاف ورزی ہو رہی ہے یہ سارے مسائل ان میں شامل ہیں۔ میں ان کی اہمیت اور ضرورت کو محسوس کرتا ہوں لیکن دستور اور عدلیہ کی بحالی، یہ دونوں میری نگاہ میں غیر مشروط ہیں اس لیے اولین ترجیح انہیں حاصل ہے۔ اس کے بعد باقی ساری چیزیں ہوں گی۔ اس لیے خدا کے لیے اس چیلنج کو محسوس کیجیے، اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کیجیے۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اور میرے ساتھی، ہر اس کام میں جو آپ اس ملک کو اور اس کی گاڑی کو پٹڑی پر ڈالنے کے لیے کریں گے، آپ کا ساتھ دیں گے۔ آپ اس بات کو محسوس نہ کریں کہ آپ کو اکثریت حاصل نہیں ہے۔ آپ اچھا کام کریں، ان شاء اللہ آپ کو اکثریت ملے گی، ہم آپ کی تائید کریں گے۔ یہ وہ بنیادی چیزیں ہیں جو میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ (۲۵ اپریل ۲۰۰۸ء)

– ۲ –

سینیٹ چیئرمین اور ڈپٹی چیئرمین کا انتخاب

جناب چیئرمین ! میں سب سے پہلے آپ (چیئرمین سینیٹ فاروق نائیک) اور ڈپٹی چیئرمین جان محمد جمالی صاحب کو منتخب ہونے پر مبارکباد دیتا ہوں۔ مجھے اجازت دیں کہ میں اتنا ضرور کہوں کہ میری جماعت اور مسلم لیگ (ن) نے، نیز مزید کچھ آزاد اراکین ساتھیوں نے، سینیٹ چیئرمین کے انتخاب کا اصولی بنیاد پر بائیکاٹ کیا۔ ڈپٹی چیئرمین کے

انتخاب میں ہم نے شرکت کی اور جان محمد جمالی صاحب کو نامزد کیا۔

آپ سے ایک گہرا ذاتی تعلق ہونے کے باوجود چیئرمین کے انتخاب کے بائیکاٹ کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہمیں گذشتہ ایک سال کے دوران بہت سے معاملات میں مایوسی ہوئی۔ ہم نے پہلے پانچ سال حزبِ اختلاف کے سینیٹرز کی حیثیت سے آپ کے ساتھ مل کر گزارے اور ایک دوسرے کے لیے تقویت کا باعث بنے۔ اس دوران ایک بڑا اچھا اعتماد کا رشتہ ہمارے درمیان قائم ہوا۔ تاہم حکومت میں آنے کے بعد کے ایک سال میں آپ کے متعدد اقدامات نے اس اعتماد کو ٹھیس پہنچائی۔

میں اس ضمن میں خصوصیت سے عدلیہ کی بحالی کی تحریک کو منتشر کرنے اور عدلیہ میں ایسے افراد کو لانے میں جو اپنی لیاقت، قابلیت اور اخلاق اور ایمانداری کی بناء پر نہیں بلکہ سیاسی وفاداریوں کی بناء پر مستحق ٹھہرے جیسے اقدامات کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ اسی طرح دستور کی ۱۷ویں ترمیم کو ختم کرنے سے دستور کی جو شکل بگڑ گئی تھی، اس حوالے سے ہمیں اس کی بحالی کی جو توقع تھی وہ بہت جلد مایوسی میں تبدیل ہو گئی۔ یہ وجہ تھی کہ پانچ سالوں کے اعتماد کے رشتے میں بڑی دراڑیں پڑیں۔ پھر اس دوران ججوں کی بحالی کے لیے لانگ مارچ یا دھرنے کے سلسلے میں جو رویہ پیپلز پارٹی کی قیادت اور حکومت نے اختیار کیا ہے وہ ہمارے لیے تو تعجب اور دکھ کا باعث تھا ہی سیاسی اعتبار سے بھی ہم اسے ایک ہمالیائی غلطی سمجھتے ہیں۔ ہم نے ان وجوہ کی بناء پر چیئرمین کے الیکشن کا بائیکاٹ کیا۔

لیکن اب جنابِ والا! آپ منتخب ہو گئے ہیں تو میں کھلے دل کے ساتھ آپ کا چیئرمین کی حیثیت سے خیر مقدم کرتا ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان شاء اللہ ہماری پوری کوشش ہو گی کہ اگر آپ قانون اور قواعد کے مطابق اس ایوان کے نظام کو چلائیں تو ہماری مکمل تائید، تعاون اور دعائیں آپ کو حاصل ہوں۔ البتہ آپ نے اگر اس معاملے میں دستور، قواعد اور روایات کا احترام نہ کیا تو ان شاء اللہ حزبِ اختلاف کی حیثیت سے ہم اپنا بھرپور

کردار ادا کریں گے۔ لیکن میں آپ سے یہ توقع رکھتا ہوں اور اس وقت آپ کے ایک بڑے بھائی ہونے کی حیثیت سے یہ نصیحت بھی کرنا چاہتا ہوں کہ آج جو ذمہ داری آپ پر پڑی ہے، آپ اس کے تقاضے صرف اس وقت پورے کر سکتے ہیں جب آپ جماعتی عصبیت سے بالا ہو جائیں۔ اب آپ اس ایوان کے محافظ ہیں۔ حکومت اور اپوزیشن سب آپ کے لیے برابر ہونے چاہییں اور آپ نے جو حلف اٹھایا ہے اس حلف کے مطابق قانونی قواعد کی مناسبت سے آپ اپنے کام کو انجام دیں۔ ان شاء اللہ اس سے آپ کا رتبہ بلند ہو گا اور آپ کی عزت بڑھے گی۔ اولین پانچ سالوں میں ہمارا آپ سے جو تعلق قائم ہوا تھا وہ نہ صرف واپس آجائے گا بلکہ اس میں بہتری اور اضافہ ہو گا۔ یہی میری دعا ہے اور یہی میری آپ کو تلقین ہے۔ میں ساتھ ہی دو تین باتیں اور کہنا چاہتا ہوں۔

چیئرمین کے حلف میں سقم: جب میں دستور کا مطالعہ کر رہا تھا تو مجھے یہ بات بڑی شدت سے محسوس ہوئی اور میں آپ کو قانون کے ایک ماہر کی حیثیت سے اس پر متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ چیئرمین سینیٹ پر ایک ذمہ داری رازداری کی بھی ہے۔ آپ نے حلف لیا ہے کہ آپ پر جب صدارت کی ذمہ داری پڑے تو آپ اس ذمہ داری کو ادا کریں گے۔ میں صدر کے حلف اور چیئرمین کے حلف کا اگر مقابلہ کرتا ہوں تو اس میں نتائج کے اعتبار سے ایک بڑا اخلاء نظر آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ صدر کے حلف کے لیے یہ ضروری ہے کہ:

اور یہ کہ میں کسی بھی شخص سے براہ راست یا بالواسطہ ذکر یا انکشاف نہیں کروں گا۔

میں آرٹیکل نہیں پڑھ رہا ہوں، میں شیڈول ۳ میں صدر کا حلف پڑھ رہا ہوں جو آرٹیکل ۴۲ کا ہے۔ حلف میں جو آخری نکتہ ہے، وہ یہ ہے کہ:

اور یہ کہ میں کسی بھی معاملے کا براہ راست یا بالواسطہ ذکر یا انکشاف نہیں کروں گا جو میرے زیرِ غور لایا جائے یا بطور صدرِ مملکت پاکستان میرے علم میں آئے۔

یہ چیز چیئرمین کے حلف میں نہیں ہے جبکہ چیئرمین کوئی نیا عہد لیے بغیر قائم مقام

صدر کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ یہ ایک خلاء ہے جس پر توجہ دینی چاہیے۔ اس لیے کہ بطور قائم مقام صدر اگر آپ کے علم میں کوئی بات آتی ہے تو اس کی رازداری کا حلف آپ نہیں اٹھا رہے۔ اس خلا کو دور کرنے کی کوشش کریں[1]۔

مفاہمت کا راستہ: جناب چیئرمین! میں آپ کی مدد کے لیے اس کے بعد صرف دو باتیں اور کہوں گا۔ پہلی چیز یہ ہے کہ یہ ملک ایک سیاسی بحران سے گزر رہا ہے اور یہ بحران میری نگاہ میں ہماری تاریخ کے نازک بحرانوں میں سے ایک ہے۔ خدا کے لیے اس مرحلہ پر مفاہمت کا راستہ اختیار کیجیے۔ مفاہمت کے لیے میرے نزدیک ایک ہی راستہ ہے کہ پنجاب سے گورنر راج بلا تاخیر اٹھایئے، اسمبلی کا اجلاس بلایئے اور اسمبلی جس کو اپنا لیڈر منتخب کرے اسے کابینہ بنانے کا موقع دیجیے۔ دوسری چیز عدلیہ کی بحالی ہے۔ ۳نومبر (۲۰۰۷ء) کا جو مارشل لاء غیر قانونی، غیر آئینی اور غیر اخلاقی طور پر ملک پر مسلط کیا گیا تھا جب تک پارلیمنٹ اسے منسوخ نہیں کرتی ہے اور ۲نومبر ۲۰۰۷ء کی عدلیہ کو بحال نہیں کرتی ہے ملک انصاف اور قانون کے راستے پر نہیں آسکتا۔

تشدد سے اجتناب: دوسری درخواست یہ ہے کہ اس وقت قوت کا جو استعمال آپ نے عدلیہ کی ایک جائز جمہوری تحریک کو ختم کرنے کے لیے اختیار کیا ہے اسے فی الفور بند کیجیے۔ منافقت کا راستہ اختیار نہ کیجیے، مفاہمت کے راستے میں ہی جمہوریت ترقی کر سکتی ہے۔ میری خواہش اور دعا ہے اور آپ سے مطالبہ ہے کہ آپ اپنا اخلاقی اثر ورسوخ استعمال کریں تاکہ ملک اس بحران سے نکلے۔ مجھے یقین ہے کہ سیاسی جماعتیں اور وکلا اپنے مقصد کو پر امن طور

---

[1] اور یہ کہ میں کسی شخص کو بلاواسطہ یا بالواسطہ کسی ایسے معاملے کی نہ اطلاع دوں گا اور نہ اسے ظاہر کروں گا جو بحیثیت صدر پاکستان میرے سامنے غور کے لیے پیش کیا جائے گا یا میرے علم میں آئے گا بجز جب کہ بحیثیت صدر اپنے فرائض کی کماحقہ انجام دہی کے لیے ایسا کرنا ضروری ہو۔ (مذکورہ بالا عبارت صدر کے حلف میں موجود ہے لیکن چیئرمین سینیٹ کے حلف میں موجود نہیں ہے۔)

پر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان پر جو تشدد کیا جارہا ہے[1] وہ ریاست کی طرف سے ہے، عوام کی طرف سے نہیں ہے۔ خدا کے لیے اس پالیسی کو بدلیے۔ آپ دیکھیں گے کہ ملک جلد ہی بحرانی کیفیت سے نکل جائے گا۔ (۱۲ مارچ ۲۰۰۹ء)

[1] ۲۰۰۸ء کے الیکشن کا بنیادی مسئلہ چونکہ آئین اور عدلیہ کی بحالی تھا اس لیے الیکشن کے نتیجے میں وفاق میں پیپلز پارٹی کی بننے والی حکومت سے توقعات تھیں کہ وہ الیکشن کے مینڈیٹ کے مطابق چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری اور ۳ نومبر ۲۰۰۷ء کی پوزیشن کے مطابق عدلیہ کے دیگر تمام ججوں کو بحال کرے گی۔ تاہم جناب آصف علی زرداری نے صدر بننے کے بعد بھی عدلیہ کو بحال نہیں کیا۔ حکومت پر دباؤ بڑھانے کے لیے عدلیہ کی بحالی کے مطالبے پر وکلاء کی قیادت نے اسلام آباد کی جانب لانگ مارچ کا اعلان کر دیا۔ اس لانگ مارچ کی حمایت مسلم لیگ (ن) سمیت دیگر سیاسی جماعتوں کی جانب سے بھی کی گئی۔ وزیر داخلہ رحمٰن ملک نے لانگ مارچ کو بغاوت قرار دیتے ہوئے سخت اقدامات کا اعلان کیا۔ حکومت نے سینکڑوں سیاسی کارکنوں کو گرفتار کر لیا حتیٰ کہ وکلاء رہنماؤں کے گھروں پر چھاپے بھی مارے گئے۔ پروفیسر صاحب کی تقریر میں اسی حوالہ سے تشدد کا ذکر کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ اس تحریک کے تسلسل میں ہی ۱۶ مارچ ۲۰۰۹ء کو وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری سمیت تمام ججوں کی بحالی کا اعلان کر دیا۔

باب نمبر ۳

اراکین پارلیمنٹ کی پارٹی وابستگی اور اختلاف کی حدود

۱۸فروری۲۰۰۸ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کو اکثریتی پارٹی ہونے کی بناء پر حکومت بنانے کا موقع ملا۔ ابتداء میں جو حکومت تشکیل دی گئی اس میں پیپلز پارٹی، مسلم لیگ(ن)، مسلم لیگ (ق)، جمعیت علمائے اسلام (ف)، عوامی نیشنل پارٹی اور ایم کیو ایم بھی شامل تھے۔ ۳۱مئی ۲۰۰۸ء کو برطرف ججوں کے مسئلے پر پیپلز پارٹی سے مذاکرات ناکام ہونے پر مسلم لیگ (ن) کے وزراء وفاقی کابینہ سے علیٰحدہ ہو گئے لیکن مسلم لیگ (ن) نے حکومت کی حمایت جاری رکھی۔ فروری ۲۰۱۱ میں ۱۸ویں ترمیم کے بعد جب بہت سی وزارتیں وفاق سے صوبوں کو منتقل ہوئیں تو ایک نئی مختصر وفاقی کابینہ تشکیل دی گئی۔ اس کابینہ میں پیپلز پارٹی کی قیادت میں عوامی نیشنل پارٹی، ایم کیو ایم، جمعیت علمائے اسلام (ف) اور مسلم لیگ (ق) شامل تھے۔

اس دوران سینیٹ میں جمعیت علمائے اسلام (ف) کے ممبران نے حزبِ اختلاف کی بنچوں پر بیٹھنے کا فیصلہ کیا حالانکہ وہ وفاقی حکومت کے اتحادی تھے۔ (ق) لیگ کے حکومت میں شمولیت پر اس کے بعض ارکان نے اپنی جماعت کے فیصلوں سے اختلاف کیا اور اپوزیشن لیڈر کے لیے پارٹی کے حمایت یافتہ امیدوار کو ووٹ نہیں دیا، جس پر پارٹی لیڈر نے چیئرمین سینیٹ (فاروق نائیک) کو خط لکھا کہ مذکورہ ارکان نے پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ کے تحت پارٹی ڈسپلن کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس لیے ان کا ووٹ نہ شمار کیا جائے۔ جس پر چیئرمین سینیٹ نے (ق) لیگ کے اندر علیٰحدہ گروپ بنانے والوں کے ووٹ شمار نہیں کیے اس طرح جمعیت علمائے اسلام (ف) کے امیدوار مولانا عبدالغفور حیدری کو بظاہر اکثریت کی بناء پر سینیٹ میں اپوزیشن لیڈر بنا دیا گیا۔

اس پسِ منظر میں ۷-۶جون کی دو مختصر تقاریر کے بعد ۱۶ جون ۲۰۱۱ء کو سینیٹ میں پروفیسر خورشید نے تفصیلی طور پر اراکین پارلیمنٹ کی پارٹی وابستگی اور اختلاف کی حدود کو واضح کیا ہے۔ ان کی اس موضوع پر تفصیلی تقاریر نے سینیٹ کے تمام اراکین کو رہنمائی فراہم کی اور چیئرمین سینیٹ نے اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کی۔

قائدِ حزبِ اختلاف کی تقرری کا مسئلہ

جناب چیئرمین! میں بڑے دکھ اور شدید ذہنی و قلبی تکلیف کے ساتھ یہ معروضات پیش کر رہا ہوں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ہم نے جب آپ کو چیئرمین منتخب کیا تھا تو میں نے آپ کو خوش آمدید کہا تھا اور تعاون کا یقین دلایا تھا۔ دیانتداری سے مقدور بھر تعاون بھی ہم نے کیا ہے۔ میں نے ایک بار نہیں کئی بار اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ پیپلز پارٹی سے تعلق کے باوجود آپ نے سینیٹ کے چیئرمین کی حیثیت سے بالعموم انصاف کیا ہے۔ دونوں اطراف کو سنا ہے اور کوشش کی کہ قانون اور دستور کے تحت معاملات طے ہوں اور ہم نے اس کی بھرپور تائید کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری نگاہ میں اپوزیشن لیڈر کی تقرری کے معاملے میں آپ سے ایک بہت بڑی غلطی ہوئی ہے اس کا اعتراف کرنا آپ کی عظمت ہو گی۔

دیکھیے، قواعد بہت واضح ہیں اور وہ یہ کہتے ہیں کہ قائدِ حزبِ اختلاف وہ ہو گا جو حزبِ اختلاف کے اراکین کا قائد ہو گا، قواعد میں پارٹیوں کا ذکر نہیں ہے۔ حزبِ اختلاف کے آزاد گروپ کی حیثیت سے تیرہ افراد تھے اور ہم تین سال سے یہ کام کر رہے ہیں۔ آپ نے ہمارے ساتھ پورا تعاون کیا اور ہم نے بھی آپ کے ساتھ پورا تعاون کیا۔ وسیم سجاد صاحب کے استعفیٰ کے بعد جب یہ عہدہ خالی ہوا تو فطری طور پر حزبِ اختلاف میں سب سے بڑا گروپ ہمارا تھا۔ اس گروپ نے آپس میں بیٹھ کر مشورہ کیا اور ہم نے ایک نام تجویز کر کے یہ کہا کہ اب یہ اس گروپ کا حق ہے کہ اس کا نمائندہ قائدِ حزبِ اختلاف بنے۔ ہمارے جے یو آئی کے بھائیوں نے بھی یہ محسوس کیا کہ ان کے پاس بھی ممبران کی ایک بڑی تعداد ہے اور بلاشبہ ایسا ہے بھی۔ ہم ان کا احترام کرتے ہیں اور ان کے ساتھ چلنا چاہتے ہیں۔ اس طرح اس وقت حزبِ اختلاف کے ۳۶ افراد میں سے ۲۴ نے آپ کو لکھ کر دیا کہ ہماری نگاہ میں محمد اسحاق ڈار قائدِ حزبِ اختلاف ہونے چاہئیں۔ یہ گروپ کی حیثیت سے ہمارا متفقہ فیصلہ تھا اور ہم نے تحریری طور پر آپ کو دیا

تھا۔ جے یو آئی نے بھی آپ کو دیا لیکن میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کس دلیل کی بنیاد پر چھتیس ارکان میں سے چوبیس ارکان کے حمایت یافتہ رکن جناب محمد اسحٰق ڈار کو اپوزیشن لیڈر تسلیم نہیں کیا گیا۔

میں دلیل سے بات کر رہا ہوں اور دلیل سے بات کروں گا لیکن اب چونکہ یہ فیصلہ سب کے سامنے آ گیا ہے، آپ اس کو ایوان میں لائیں.....

ہم دلیل سے بات کریں گے اور آپ یہ سمجھ لیں کہ اگر ہم پر اس معاملے میں کوئی بات ٹھونسی گئی تو حزبِ اختلاف قبول نہیں کرے گی۔ احترام اپنی جگہ پر اور قانون اپنی جگہ.....

[اس موقع پر چیئرمین سینیٹ نے پروفیسر خورشید احمد اور بعض دیگر اراکین سے چیمبر میں آ کر ان کے تحریری فیصلے کو پڑھنے کی درخواست کی جس پر اکثریت نے کہا کہ چیئرمین اپنا فیصلہ براہ راست ایوان میں پڑھ کر سنائیں۔ پروفیسر خورشید احمد نے اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے کہا کہ میں اس فیصلے کو دیکھنے کے لیے تیار ہوں لیکن ہماری نگاہ میں آپ نے ناانصافی کی ہے غلط کیا ہے ہمیں اس سے شدید اختلاف ہے اس طرح ایوان کو نہیں چلایا جا سکتا۔] (۶ جون ۲۰۱۱ء)

– ۲ –

جنابِ والا! یہ مسئلہ خاصا اہم ہے۔ درحقیقت ایوان کو کبھی بھی قائدِ حزبِ اختلاف کے بغیر نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن اس معاملہ میں تاخیر کو اب ایک مہینہ ہونے کو جا رہا ہے۔ ۲ مئی کو (ق) لیگ کے لوگ ہٹے ہیں جس کے بعد یہ جگہ خالی ہوئی ہے، اس کے بعد میرے علم کے مطابق آپ کو باقاعدہ تحریری درخواست بھی دے دی گئی تو اس میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔

اراکین کی قسمیں

جناب چیئرمین! دنیا بھر کے ایوانوں میں اراکین کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک سرکاری بنچ ہوتی ہے، دوسری حزبِ اختلاف اور تیسری آزاد اراکین کی ہوتی ہے۔ سرکاری بنچوں میں ہو سکتا ہے کہ مختلف پارٹیاں ہوں لیکن چونکہ انہوں نے ایک اتحاد کیا ہے اس لیے

ان کو ایک گروپ ہی سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح اپوزیشن میں ایک پارٹی ہو یا مختلف پارٹیوں کا مجموعہ ہو اگر انہوں نے اپنے آپ کو باقاعدہ ایک گروپ بنایا ہے تو وہ ایک گروپ سمجھا جاتا ہے ورنہ وہ الگ الگ سمجھے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر برطانیہ کی پارلیمنٹ میں جب کنزرویٹو اقتدار میں تھے اور لیبر پارٹی اپوزیشن میں تھی تو لبرلز ایک الگ گروپ تھا اور ان کو ایک کل کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ ڈیموکریٹس کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا گیا۔ ہندوستان کی پارلیمنٹ میں بھی یہی صورت حال ہے اور اس ایوان میں بھی میں آپ کو یاد دلاؤں کہ ۲۰۰۳ء کے بعد جو صورت حال تھی اس میں پیپلز پارٹی کے میاں رضا ربانی کو قائدِ حزبِ اختلاف بنایا گیا لیکن ہم نے ان سے اپنی جماعت کو الگ رکھا۔ دونوں گروپوں کی تعداد میں ایک نمبر کا فرق تھا اس لیے ہم نے اسے مسئلہ نہیں بنایا۔ ہم نے ان کی تائید کی لیکن اپنی الگ حیثیت کو برقرار رکھا۔

۲۰۰۸ء کے بعد صورت حال یہ بنی کہ مسلم لیگ (ق) کو اکثریت حاصل تھی لیکن آزاد حزبِ اختلاف گروپ کو ایک علیحدہ گروپ کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا، ہم نے اپنی آزاد حیثیت کو برقرار رکھا۔ پہلے اس میں مسلم لیگ (ن) شامل نہیں تھی لیکن جب انہوں نے حکومت چھوڑی تو اسی گروپ میں شرکت کی اور ہم نے ان کو قبول کیا۔ اس وقت چونکہ ان کے سات ممبرز تھے باقی لوگ چھے تھے تو ہم نے کہا کہ گروپ لیڈر کے لیے انتخاب ہو جائے اور اس انتخاب میں ہم نے راجہ ظفر الحق کو لیڈر منتخب کیا، اس سے پہلے اس گروپ کو میں لیڈ کر رہا تھا۔ آزاد اراکین اگر اپنے آپ کو حزبِ اختلاف میں شامل کر لیں یا حکومت انہیں شامل کر لے تو وہ حکومت کا حصہ ہوتے ہیں ورنہ وہ ایک الگ گروپ ہوتے ہیں۔ اس پارلیمنٹ میں اور اس سے پہلے کی پارلیمنٹ اور قومی اسمبلی میں آزاد اراکین اپنی آزاد حیثیت سے الگ رہے ہیں۔ ان کو اپوزیشن کا حصہ اس وقت سمجھا جاتا ہے جب وہ اپوزیشن کے کسی ایک گروپ کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کر لیں، ورنہ وہ آزاد ہیں۔

اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ جو ڈھانچہ ہے اس کو آپ سامنے رکھیں اسے گڈ مڈ نہ کریں۔ جن اراکین نے حکومتی بنچوں پر بیٹھنا منظور کیا ہے اور حکومتی بنچوں کے ساتھ ووٹ

دے رہے ہیں وہ بادی النظر میں حکومتی بنچوں کا حصہ ہیں۔ اس پس منظر میں آپ کی توجہ آپ کی رولنگ کے پیراگراف چار کی طرف مبذول کراؤں گا، آپ دیکھیں:

> مسلم لیگ (ق) کے رہنما چوہدری شجاعت حسین نے مسلم لیگ (ق)، اے این پی، ایم کیو ایم اور جے یو آئی کے اراکین کے ناموں پر مشتمل ایک فہرست بھی پیش کی ہے اور کہا ہے کہ اگر مسلم لیگ (ق) کے اتحادی سینیٹرز جنہوں نے سینیٹر اسحاق ڈار کی حمایت میں دستخط کیے ہیں، ان کے ووٹ شمار کیے جاتے ہیں تو مذکورہ جماعت کے ممبران کے نام مولانا عبدالغفور حیدری کے حامیوں میں بھی شمار کیے جائیں۔

حقائق پر مبنی ہو یا نہ ہو آپ نے جس بنا پر ۹ افراد کو حق رائے دہی سے محروم کیا ہے اس کی بنیاد پر چوہدری شجاعت صاحب نے یہ مؤقف اختیار کیا ہے۔ اگر ان کی یہ بات صحیح ہے تو کیا میں یہ سمجھوں کہ غفور حیدری صاحب، جو میرے بڑے محترم ساتھی ہیں، PML(Q), ANP اور MQM کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو انھیں تو اس صورت میں قائدِ حزبِ اختلاف نہیں شاید قائدِ ایوان ہونا چاہیے۔ آپ نے ان افراد کو جو ۱۰۰ فیصد حکومت کے ساتھ تھے اور ہیں، اگر ان کی بنیاد پر کچھ لوگوں کو رائے دہی سے محروم کرنے کی پوزیشن اختیار کی ہے، تو کم از کم میں آپ سے اس کی توقع نہیں رکھتا۔

میں کہنا چاہتا ہوں کہ تمام دلائل کو سامنے رکھ کر آپ کو اس معاملے میں اپنی اس رولنگ پر نظر ثانی کرنا چاہیے۔ ہم آپ سے توقع رکھتے ہیں کہ آپ انصاف کریں گے جس طرح ماضی میں کیا گیا ہے اور اگر آپ نے اس معاملے میں انصاف نہ کیا تو ہم مجبور ہوں گے کہ اور جتنے بھی ذرائع ہیں انہیں اختیار کیا جائے۔ (۷ جون ۲۰۱۱ء)

کیا پارلیمانی پارٹی لائن سے ہٹ کر ووٹ دیا جا سکتا ہے؟

جناب چیئرمین! میرے اور میری جماعت کے سامنے ایک اصولی صورتحال ہے جس کا تعلق اس ایوان اور ملک میں جمہوریت کے مستقبل سے ہے۔ میرے لیے جناب اسحاق ڈار اور مولانا عبدالغفور حیدری دونوں بہت محترم ہیں۔ جماعت اسلامی اور جے یو آئی کا نظریاتی اور ملک کے بیشتر مسائل پر اشتراک فکر ہے، خواہ اس کی کوئی بھی شکل ہو۔ ماضی میں ہمارا تعاون رہا ہے، آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ اس لیے میں پورے ادب سے یہ بات کہوں گا کہ میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں وہ کسی بھی ذاتی معاملے سے بالا ہو کر کہوں گا اور ان شاء اللہ کسی کے بارے میں کوئی براہ راست یا بالواسطہ اشارہ نہیں ہو گا۔ میں آپ کے سامنے صرف اصولی، قانونی اور اخلاقی پوزیشن واضح کرنا چاہتا ہوں۔

جنابِ والا! دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قرآن پاک ہمارے لیے ہدایت کا سرچشمہ ہے اور قرآن پاک میں جو واضح ہدایت ہمیں کی گئی ہے، وہ انصاف اور سچی گواہی کی ہے۔ خواہ اس کی زد انسان کی اپنی ذات، اپنے والدین اور اعزاء پر پڑتی ہو اور یا معاشرے کے کسی خاص گروہ، امیر یا غریب پر پڑتی ہو۔ ہماری وفاداری اللہ، انصاف اور حق سے ہے، ذاتیات سے نہیں ہے۔ میں اس سلسلے میں خاص طور پر آپ کو سورۃ النساء کی آیت ۱۳۵ کی طرف متوجہ کروں گا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝ (النساء ۴:۱۳۵)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو۔ اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات، تمہارے والدین اور

رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ ہو۔ فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے، لہٰذا اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کرو۔ اگر تم نے لگی لپٹی رکھی یا سچائی سے پہلو تہی کی تو جان لو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو، اللہ کو اس کی خبر ہے۔

جنابِ والا! میں اپنے آپ کو، آپ کو اور اس ایوان کے تمام افراد کو بھی اس آیت کا مخاطب سمجھتا ہوں۔

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (اٰل عمرٰن ۳:۱۵۹)

پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو۔

جنابِ والا! اس سے پہلے اس ایوان میں قرآن کی ایک اور آیت کے حوالہ سے بھی نصیحت کی گئی ہے۔ بلاشبہ قرآن میں یہ حکم آیا ہے لیکن جنابِ والا! جب بھی ہم قرآن پاک سے دلیل لائیں تو ہمیں اس معاملے میں احتیاط برتنی چاہیے کہ ہمارے سامنے پوری آیت ہو۔ سورۃ اٰل عمرٰن میں آیت نمبر ۱۵۹ جس میں یہ حکم کیا گیا ہے، اس میں اس سے پہلے کچھ اور ہدایت بھی کی گئی ہے۔ پوری آیت اس طرح ہے:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (اٰل عمرٰن ۳:۱۵۹)

اور دین کے کام میں ان کو بھی شریک مشورہ رکھو، پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو۔

یعنی تمام معاملات میں مشورہ کرو اور مشورے کے بعد جب تم ایک بات طے کر لو تو اللہ کے بھروسے پہ اس پر قائم ہو جاؤ۔

جنابِ والا! ہمیں اس معاملے میں احتیاط برتنی چاہیے۔ مشاورت فیصلے سے پہلے ہوتی ہے، اس کے بعد نہیں اور مشاورت کو نظر انداز کر کے عزم کی بات کرنا، میرے خیال میں نصف بات ہے۔ ہمیں اس معاملے میں زیادہ محتاط ہونا چاہیے۔

جنابِ والا! ان دو گزارشات کے بعد میں آپ کے سامنے چار نکات پر بات کروں گا۔ مجھے توقع ہے کہ ان شاء اللہ جو چیزیں آپ نے سامنے رکھی ہیں ان کا اپنی حد تک احاطہ کر سکوں گا اور کوئی چیز رہ جائے تو آپ کا اختیار ہے کہ آپ سوال کر کے مجھ سے وضاحت لے لیں۔

چیئرمین اپنی رولنگ پر کب نظر ثانی کر سکتا ہے؟

جنابِ والا! اس میں پہلی بات یہ ہے کہ میں آپ کو دل کی گہرائیوں سے ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں کہ ایک رائے قائم کرنے کے بعد، جب آپ نے دیکھا اور محسوس کیا کہ کچھ ایسے مسائل ہیں جن پر اطمینان نہیں ہے تو آپ نے اس پر نظر ثانی کے لیے کہا ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ جہاں میں اس کی قدر کرتا ہوں، وہاں یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اسپیکر اور چیئرمین کی رولنگز بالعموم آخری چیز ہوتی ہیں۔ ہم نے ہمیشہ اس بات کو تسلیم کیا ہے اور تسلیم کرنا بھی چاہیے۔ یہ پارلیمانی روایت کا حصہ ہے۔ اگر ہم کسی رولنگ سے اختلاف بھی کریں تب بھی اس کو تسلیم کرنا چاہیے۔ ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر رولنگ میں کوئی ایسا سقم رہ جائے جس کو ٹھوس بنیاد پر جانچا جائے اور وہ انصاف کے تقاضوں کو پورا نہ کر رہا ہو تو پھر اس کو دوبارہ دیکھا جاتا ہے۔

اس معاملے میں تین چیزیں ایسی ہیں جو لازم کر دیتی ہیں کہ رولنگ کو دوبارہ دیکھا جائے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ اگر رائے قائم کرتے وقت تمام حقائق موجود نہ ہوں اور بعض اضافی حقائق بعد میں سامنے آئیں تو فیصلہ کرنے والا اپنے صوابدیدی اختیار سے یا اس بنیاد پر کہ کوئی اس کو متوجہ کرے خود اپنی بات پر نظر ثانی کر سکتا ہے تو یہ ایک حقیقی وجہ ہے۔ اس معاملے میں آپ نے جس وقت ۶ جون کا فیصلہ کیا ہے وہ اگرچہ ان بہت سی دستاویزات سے متعلق ہے جو پچھلے تین سالوں پر محیط ہیں لیکن میرے علم کی حد تک وہ اس وقت آپ کے سامنے نہیں تھیں۔ جو کاغذات آپ کے سامنے تھے، آپ نے ان ہی پر غور کیا اور آپ ایک رائے پر پہنچے۔ مزید شہادتیں، جو حقائق پر مبنی ہیں، موجود ہیں اور اب یہ ہمارے اور آپ کے

سامنے بھی آگئی ہیں۔ ہمیں اس کی ایک مصدقہ کاپی بھی مل گئی ہے۔ یہ ایک وجہ بہت کافی ہے مسئلے پر دوبارہ بحث کے لیے تاکہ اس پر سینیٹ میں غور کیا جائے۔

جنابِ والا! دوسری وجہ بیان کرنے کے لیے میں خاص طور پر آپ کو "Black's Law Dictionary کی طرف متوجہ کروں گا۔Black's Law Dictionary میں اس مسئلے کو واضح کیا گیا ہے اور کسی معاملہ میں رولنگ پر نظر ثانی کے لیے یہ کہا گیا ہے کہ:

"منصفانہ طور پر دوبارہ جانچنے کے لیے نظر ثانی کریں یا انتظامی نقطۂ نظر سے دوبارہ غور یا دوسرا نقطۂ نظر پتہ کریں یا تصحیح کی خاطر دوبارہ جانچ پڑتال اور مزید جائزہ لیا جائے یا غور کیا جائے"۔

اس کے بعد واضح کرتا ہے کہ:

"اصلاح کے نقطۂ نظر سے دوبارہ غور کر لیں، دیکھ لیں یا جانچ پرکھ لیں، نظر ثانی کر لیں"

پھر اسی کو دوبارہ سماعت میں واضح کرتا ہے، جہاں ایک اور طرح سے زیر بحث معاملہ پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

کسی بھی مسئلے کا پہلی بار جائزہ لیتے ہوئے جس میں فرض کیا جاتا ہے کہ دونوں پارٹیوں کو سماعت کا موقع دیا جائے اگر کوئی غلطی یا بھول چوک یا فروگزاشت ہو گئی ہو تو اسباب پر دوبارہ غور کرنے کے لیے عدالتوں یا انتظامی بورڈوں کو متوجہ کرنے کے لیے۔

وہ آگے کہتا ہے کہ:

"سماجی تحفظ کے معاملات پر غور کرتے ہوئے بہتر مقاصد کے لیے بعض مخصوص وجوہات کی بناء پر ضرر رساں انتظامی فیصلوں پر دوبارہ غور کیا جا سکتا ہے"۔

میں ان حوالوں سے جو استدلال کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اس سے تین چیزیں واضح ہوتی ہیں۔ پہلی چیز یہ کہ اگر شہادتوں، حقائق، معلومات اور یادستاویزات میں کوئی کمی رہ گئی ہے تو اس پر دوبارہ غور کرنے کے لیے بحث مباحثہ کرنا ضروری ہے۔

دوسری چیز، اگر کوئی بھول چوک ہو گئی ہے تو اس کمی کو ٹھیک کرنا بہت ضروری ہے۔ میری نگاہ میں اس معاملے میں جو بڑے بڑے فروگزاشت ہوئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ آزاد اراکین کی پارلیمنٹ میں پوزیشن اور مختلف مسائل پر ان کے ووٹ کا حق زیرِ غور نہیں آیا۔

یعنی آزاد اراکین کی حیثیت اور مختلف مسائل پر ان کے ووٹنگ کے حقوق اور ان کا حزب اختلاف سے تعلق وہ مسئلہ ہے جو نظر انداز ہوا ہے۔

دوسری فروگزاشت ان افراد کے حقوق سے متعلق ہے جنھوں نے اپنی پارٹی کے ایک فیصلے کو قبول نہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو حزبِ اختلاف میں رکھنے کا فیصلہ کیا۔ دیکھنا ہو گا کہ فی الحقیقت ان کے حقوق کیا ہیں۔

تیسری چیز یہ ہے کہ جن افراد کو ووٹ سے محروم کیا گیا ان تمام کو ان کے ووٹ مسترد کرنے سے پہلے کیا شنوائی کا حق دیا گیا ہے یا نہیں، اس لیے کہ یہ ان کا بنیادی حق ہے۔

اب اگر ان لوگوں کو ریفرنس سے پہلے شنوائی نہیں دی گئی، تو فیصلہ پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت واضح ہوتی ہے۔

جناب چیئرمین! میں نے نظر ثانی کے حق میں تین دلیلیں دی ہیں:

اول نئے مواد کی روشنی میں دوم جو غلطی یا بھول چوک جسے درست کرنا ہے اور سوم شنوائی کا حق جو نہیں دیا گیا، جو اب آپ انھیں دے رہے ہیں۔

قائدِ حزبِ اختلاف کے تقرر کا طریقہ کار؟

اب میں اصل مسئلہ کی طرف آتا ہوں۔ میرے خیال میں، میں پہلے حزبِ اختلاف

کے اراکین کے مسئلے پر بات کروں گا۔ جناب چیئرمین! میں آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ سینیٹ کے رولز کو بڑے غور سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ۱۹۷۳ء سے ۱۹۸۶ء تک پرانے رولز تھے۔ ان رولز میں آپ کو قائدِ حزبِ اختلاف کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

اس زمانے میں کوئی قائدِ حزبِ اختلاف نہیں ہوا کرتا تھا۔ نئے رولز میں یہ اضافہ کیا گیا اور قائدِ حزبِ اختلاف کا تصور یہاں پر آیا۔

میں رول ۲ پڑھتا ہوں:

"مطلب ہے ایوان کا ایک رکن جو سینیٹ کے چیئرمین کی رائے میں اس وقت ایوان میں حکومت کی مخالفت کرنے والے اراکین کا قائد ہے"۔

دوسرے الفاظ میں ایک طے شدہ صورت ہے۔ اس میں دو مفروضات ہیں، ایک یہ ہے کہ ایک واضح اپوزیشن موجود ہے اور دوسرا یہ ہے کہ اس اپوزیشن کے ساتھ کوئی لیڈر بھی ہے یا، دوسرے الفاظ میں، اس میں کوئی ایسا شخص ہے جسے اپوزیشن کے اراکین کی اکثریت کی تائید حاصل ہے۔ یہ دو اجزاء ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ اپوزیشن ایک کل ہے جس کے اراکین معلوم ہونے چاہئیں، مبہم نہیں ہیں اور یہ بھی مبہم نہیں ہے کہ ان کی اکثریت کس کو اپنا لیڈر چاہتی ہے اور اس کو ہمیں جاننا چاہیے۔ جب تک کہ دونوں چیزیں بالکل واضح نہ ہوں، ہم یہ نہیں کر سکتے۔

دہراتا ہوں، اس کے معنی یہ ہیں کہ ایوان میں اراکین کی ایک معلوم تعداد حزبِ اختلاف میں ہے، پارٹی نہیں کہا ہے، اور یہ کہ حزبِ اختلاف کے ان اراکین کی اکثریت کس کو اپنا لیڈر چاہتی ہے اور آپ کا کام یہ ہے کہ آپ اس کو شناخت کریں۔ اس ضمن میں آپ برطانیہ کی پارلیمانی تاریخ دیکھیں یا بھارت کی پارلیمانی تاریخ دیکھیں تو دونوں جگہ ہمیں یہ چیز ملتی ہے۔ میرے پاس حوالے ہیں میں وقتاً فوقتاً ان کی جانب بھی اشارے کر دوں گا۔

اور دوسرا یہ ہے کہ حکومت کی مخالفت کرنے والے وہ معروف اشخاص، جن کی تعداد معلوم ہو، ایسے ہی بغیر لیڈر نہیں ہے بلکہ: کوئی ہے جسے اکثریت کی حمایت حاصل ہے۔ اکثریت کی حمایت کے تعین اور تعداد کے تعین کا معاملہ ہے۔

یہ دونوں باہم جڑے ہیں، ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ روایات بھی یہی ہیں۔ آپ خواہ برطانوی پارلیمنٹ کو لے لیں یا انڈین پارلیمنٹ کو، وہاں اپوزیشن ہمیشہ ایک معلوم وحدت تھی۔ اس سلسلے میں بڑی دلچسپ بات ہے کہ ۱۹ویں صدی سے پہلے قائد حزبِ اختلاف کا یہ تصور موجود نہیں تھا۔ یہ ۱۹ویں صدی کے وسط میں شروع ہوا ہے اور ۱۹۲۰ء میں نکھر کر سامنے آیا لیکن اس کے بعد سے بالکل واضح ہے۔

بھارت کے شروع کے سالوں میں کوئی قائدِ حزبِ اختلاف نہیں ہوتا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ایک جانب کانگریس پارٹی حکمراں تھی اور دوسری جانب چھوٹے چھوٹے گروپ تھے۔ ان کے علاوہ آزاد اراکین (۷۰ سے ۷۲) تھے لیکن ان میں سے کسی کو کبھی قائدِ حزبِ اختلاف نہیں مانا گیا۔ قائدِ حزبِ اختلاف پہلی بار تب مانا گیا جب کانگریس کی حکومت میں ہی کانگریس کے ایک گروپ نے اس کے مقابلہ میں اختلاف کیا۔ جگ جیون رام ان کا لیڈر تھا۔ اس کے گروپ میں ۶۰ ممبرز تھے اور ان کے سربراہ کے طور پر پہلی مرتبہ اسے قائد حزب اختلاف تسلیم کیا گیا۔

May میں بھی یہی چیز موجود ہے اور M.N. Kaul میں بھی یہ چیز موجود ہے۔ میرے پاس سارے حوالے ہیں۔ آپ خود ان کو ملاحظہ فرمالیں، میں آپ کو متعلقہ صفحات دے سکتا ہوں۔ یہ بالکل واضح چیز ہے۔

جناب چیئرمین! اس کے بعد میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اپوزیشن ایک پارٹی بھی ہو سکتی ہے، پارٹیوں کا مجموعہ بھی ہو سکتی ہے۔ ہمارے ہاں صورتحال یہی ہے کہ جو اپوزیشن ہے وہ پارٹیوں کا مجموعہ ہے۔ اس بنا پر جو آپ کو کام کرنا تھا وہ صرف یہ تھا کہ:

حزبِ اختلاف کے معروف اراکین اور جو ان اراکین کی اکثریت کی حمایت رکھتا

ہو اس کا تعین قائدِ حزبِ اختلاف کی حیثیت سے کر دیتے۔

اس سے ہٹ کر کوئی چیز آپ کو نہیں کرنی تھی۔ یہاں M.N. Kaul کی کتاب سے ایک چیز پڑھ کر آپ کو سناتا ہوں جو کہ اس معاملے میں بہت متعلقہ ہے۔

یہ پانچواں ایڈیشن ہے۔ Practice and Procedure of Parliament کا باب نمبر ۱۴ اور صفحہ نمبر ۳۵۸ ہے۔ جنابِ والا! اس میں یہ بات کہی گئی ہے:

> اسپیکر اپنے طور پر یہ شناخت نہیں کر سکتا بلکہ اس سلسلے میں اسے ایک رسمی درخواست دی جانی چاہیے۔ اس درخواست پر تمام متعلقہ اراکین کے دستخط ہونا چاہییں۔

یعنی وہ پھر یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ محض تاثر کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ اراکین کی طرف سے تحریری درخواست ہونی چاہیے اور تحریری دستاویزی ثبوت کی بنیاد پر۔ میں پورا پیراگراف دوبارہ پڑھ دیتا ہوں۔

> ”یہ بھی ہدایات موجود ہیں کہ ایوان میں ایک گروپ یا پارلیمانی پارٹی کے طور پر اراکین کی ایسوسی ایشن کی صرف اسپیکر منظوری دے گا اور اس سلسلے میں اسپیکر کا فیصلہ حتمی ہو گا۔ اسپیکر اپنے طور پر ایسے اراکین کی ایسوسی ایشن کو تسلیم نہیں کر سکتا بلکہ متعلقہ اراکین کی جانب سے اس سلسلے میں ایک رسمی درخواست دی جانی ضروری ہے۔ اسپیکر کے نام ایسی تحریری درخواست میں متعلقہ اراکین کی ایسوسی ایشن کو بتانا ہو گا کہ وہ ایک پارٹی یا گروپ کی صورت میں حزبِ اختلاف کے طور پر اس سلسلے کی تمام شرائط کو پورا کرتے ہیں۔ اس درخواست پر تمام متعلقہ اراکین کے دستخط ہونا ضروری ہیں“۔

یہ بڑا اہم نکتہ ہے جنابِ والا! اور وہی بات ہے جو میں نے آپ سے عرض کی تھی کہ حزبِ اختلاف کے لیے ایک معلوم شدہ تعداد اور شناخت ضروری ہے۔ پھر آپ کو ایک

حقیقت کو شناخت کرنا ہے۔ بحث کا طریقہ کار بھی یہ ہے کہ درخواست آپ کو دی جائے گی اور وہ تحریری ہونی چاہیے۔ اس درخواست میں واضح ہونا چاہیے کون کون اس میں شریک ہیں اور اس کی بنیاد پر آپ جانیں گے۔ چیئرمین خود سے ایسا کرنے کا مجاز نہیں ہے۔

میں یہاں وضاحت بھی کر دوں کہ بھارتی گروہی سیاست میں حکمراں گروپ ہے یا حزبِ اختلاف ہے اور گروپ کے معنی یہ ہیں کہ ہر وہ گروپ جو سیاسی طور پر منتخب ہو کر آیا ہو اور اس کا ایک پروگرام ہو اور گروپ میں کم از کم تیس افراد ہوں۔ بھارتی آئین کے دسویں شیڈول میں دی گئی عبارت میں پڑھ دیتا ہوں۔ یہ صفحہ ۳۱۸ پر ہے۔

۱۔ ان کے پاس سیاسی، معاشی اور سماجی میدانوں میں منفرد نظریہ اور لائحہ عمل ہونا چاہیے جس کا اعلان انہوں نے عام انتخابات کے موقع پر کیا تھا اور اس کی بنیاد پر وہ اس ایوان میں آئے ہیں۔ انھیں ایک ہم آہنگ یونٹ تشکیل دینا چاہیے جو ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر خود کو ایک منفرد شناخت دے سکیں۔

۲۔ ایوان کے اندر اور باہر ان کی ایک تنظیم ہونی چاہیے جس کا ملک کو درپیش تمام اہم مسائل پر رائے عامہ سے رابطہ ہو۔

۳۔ ان کے اراکین کی تعداد ایوان کے اجلاس کو چلانے کے لیے مقررہ 'کورم' سے کم نہیں ہونی چاہیے جو کہ ایوان کے اراکین کی کل تعداد کا ۱۰/۱ ہے۔

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ تیس کی تعداد نہیں ہے البتہ خصوصی صورتحال میں اسپیکر نے تیس سے کم کو بھی گروپ تسلیم کیا اور Kaul نے بھی یہی لکھا ہے۔

اراکین پارلیمنٹ کی تین حیثیتیں

جناب چیئرمین! اب جو میں استدلال کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ایک شخص جب پارلیمنٹ میں منتخب ہوتا ہے تو اس کی تین حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک حیثیت ہے کہ وہ ایک

حلقۂ انتخاب کی نمائندگی کر رہا ہے۔ قومی اسمبلی میں یہ نمائندگی محدود علاقے کی ہوتی ہے، سینیٹ میں پورا صوبہ حلقۂ انتخاب ہے۔ دوسرا وہ ایک پارٹی کی نمائندگی کر رہا ہے اور تیسرا وہ ایک باشعور انسان ہے، اپنے ضمیر کے مطابق وہ اپنے آپ کی نمائندگی کر رہا ہے۔ ان تینوں حیثیتوں کے درمیان ایک توازن قائم کیا جاتا ہے۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ پارلیمانی نظام کا بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ اس میں آنے والے اراکین بلاشبہ ایک پارٹی کے ٹکٹ پر ایک حلقۂ انتخاب سے منتخب ہوتے ہیں لیکن منتخب ہونے کے بعد جہاں پارٹی کی نمائندگی کرتے ہیں وہیں وہ اس حلقۂ انتخاب کے تمام لوگوں کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ اس حیثیت میں جنہوں نے آپ کو ووٹ نہیں دیے ان کا بھی آپ پر اتنا ہی حق ہے جتنا ان کا جنہوں نے آپ کو ووٹ دیا ہے۔ یوں خود اس حلقۂ انتخاب کی نمائندگی اراکین پارلیمنٹ کا ایک کام ہے اور اس کا تعلق محض پارٹی کے مفاد سے نہیں۔ دوسرے بلاشبہ پارٹی کے ٹکٹ پر وہ آیا ہے، پارٹی کے پروگرام پر یقین کرتا ہے، پارٹی نے اس کی حمایت کی ہے، اس لیے پارٹی ڈسپلن اور پارٹی کے تقاضوں کو پورا کرنا بھی اس کی ذمہ داری ہے اور تیسرے اس کا اپنا ضمیر ہے، کیا حق ہے، کیا ناحق ہے، کیا سچ ہے، کیا غلط ہے۔ تو ان تینوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر نظام میں ان کا تحفظ ہونا چاہیے۔

اگر نظام میں ان تینوں کا تحفظ نہیں ہے تو یہ ایک غیر متوازن صورتحال ہوگی۔ تو اس لیے جب بھی آپ پارٹی، پارٹی سے انحراف اور پارٹی ڈسپلن کے بارے میں غور کریں گے، ان تینوں جہات کو سامنے رکھنا پڑے گا۔ یہ میں اپنی جانب سے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ جتنی بھی کتابیں اس موضوع پر آپ پڑھیں گے ان میں یہی چیزیں آپ کو ملیں گی۔ May کی جو کتاب ہے اس کے اندر اس پر بار بار زور دیا گیا ہے اسی طرح Kaul نے بھی اس نکتہ کو لیا ہے۔

کیا پارٹی میں مختلف گروپوں کی گنجائش ہے؟ جناب چیئرمین! یہ سوال اپنی جگہ بہت اہم ہے کہ اگر ایک طرف ایک پارٹی کی جانب سے منتخب ہو کر اس کے فیصلوں سے ہٹنا اخلاقی طور پر غلط چیز ہے لیکن دوسری طرف اگر ایک شخص کا ضمیر اور اس کا حلقہ انتخاب اس بات کا تقاضا

کرتا ہو کہ اس کو پارٹی سے مختلف کردار ادا کرنا ہے تو کیا اس کی گنجائش موجود ہے۔ میں عاجزی سے پیش کروں گا کہ پارلیمانی جمہوریت کے اندر اس کی گنجائش موجود ہے اور ضمیر کے مطابق ووٹ دینا پارلیمانی عمل کا ایک معروف طریقہ ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے کہ پارٹی میں مختلف گروپ ہوں۔ آرٹیکل ۶۳(اے) کا یہاں حوالہ دیا گیا ہے اور میں بھی اسے ریفر کرنا چاہتا ہوں کہ ایک پارٹی بلاشبہ ایک پارٹی ہے لیکن ایک پارٹی میں ایک سے زیادہ گروپ ہو سکتے ہیں، ضمنی اور کھلے بھی۔ آج نہیں پوری پارلیمانی تاریخ بھری پڑی ہے جس میں فارورڈ بلاک، سینٹر کور، سرکاری نشستیں اور پچھلی نشستوں پر بیٹھنے والے کی جانی پہچانی اصطلاحات استعمال ہوتی نظر آتی ہیں۔

حتٰی کہ حکمران جماعت میں بھی ان سب کو مانا جاتا ہے۔ ان میں اختلافات بھی ہوتے ہیں اور ان کے اختلافات کو قبول بھی کیا جاتا ہے۔ ٹھیک ہے کچھ سرخ لکیریں بھی ہوتی ہیں، وہ سرخ لکیریں پار نہیں ہونی چاہییں لیکن اس ڈھانچے کے اندر لچک موجود ہے۔ جس طرح چینی قیادت کا "ایک ملک دو نظام" کا دعویٰ ہے اسی طرح یہ بات بھی صحیح ہے کہ ایک پارٹی کے اندر کئی گروپ ہوں۔ محض گروپ ہونا اپنی پارٹی سے علیحدگی نہیں ہے اور گروپ اپنی اس حیثیت سے فیصلے بھی کر سکتا ہے، عوامی سطح پر کوئی مؤقف بھی لے سکتا ہے، ووٹ بھی دے سکتا ہے اور اس سے اس کی پارٹی سے تعلق یا وفاداری متاثر نہیں ہوتی حتٰی کہ وہ سرخ لکیر پار کر لے۔ لیکن جب تک وہ سرخ لکیر پار نہیں کرتا تو پھر اس کو یہ آزادی حاصل ہے۔

لوٹا کریسی کیا ہے؟: جنابِ والا! ہمارے ہاں 'لوٹا کریسی' کی باتیں بہت ہو رہی ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ 'لوٹا کریسی' ایک آفت اور ایک عذاب ہے۔ لیکن 'لوٹا کریسی' ہے کیا؟ 'لوٹا کریسی' یہ ہے کہ مفادات کی خاطر، عہدے اور وزارتیں حاصل کرنے کے لیے اور مراعات کے لیے آپ اپنی پارٹی کو چھوڑ کر کسی دوسرے سے مل جائیں۔ یہ ہے 'لوٹا کریسی'۔ لیکن اگر آپ حکومت کا حصہ ہونے کی بناء پر حاصل فوائد سے انکار کرتے ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ میری نگاہ میں، اصولی حیثیت سے جو مؤقف ہے، وہ حکومت کے ساتھ ملنے کا نہیں بلکہ

حکومت سے باہر رہنے کا ہے تو یہ لوٹا کریسی نہیں ہے، یہ ضمیر کی آواز ہے۔ یہ اصول کی آواز ہے اور اسے تسلیم کیا گیا ہے۔ میں آپ کو مثالیں دینا چاہتا ہوں کہ جو پہلی دھڑے بندی کانگریس کی بھارت میں ہوئی ہے، جب جگ جیون رام کی قیادت میں ۶۰ اراکین اس سے ہٹے ہیں، تو اس موقع پر برسر اقتدار دھڑے میں ۳۰۰ کے قریب ارکان کانگریس تھے اور ۶۰ وہ تھے جو اپوزیشن میں آئے، تو کانگریس (اپوزیشن) پہلی مرتبہ لکھا گیا: انھیں حزبِ اختلاف کے طور پر تسلیم کیا گیا تھا۔ انھیں حزبِ اختلاف کا قائد رکھنے کی اجازت دی گئی اور حزبِ اختلاف کے لیڈر کو وہ تمام تر سہولتیں میسر آئیں جو حزب اختلاف کے لیڈر کی حیثیت سے انھیں ملنا چاہیے تھیں۔

انگلستان کی مثال میں آپ کو دیتا ہوں، تاریخی واقعہ ہے۔ ۱۹۷۰ء میں جب لیبر پارٹی کی قیادت میں چار ممتاز لوگ، جن کی قیادت Shirley Williams کر رہی تھی، پارٹی سے الگ ہوئے لیکن استعفیٰ نہیں دیا۔ انہیں لبرل پارٹی کا ایک گروپ تسلیم کیا گیا اس کے بعد ہی پھر لبرل ڈیموکریٹک وجود میں آئی۔ یہ ساری تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ ایک پارٹی میں ایک سے زیادہ گروپ نہیں ہو سکتے اور ایک پارٹی کے معنی ایک گروپ ہیں، جس کے تمام ارکان ہر مسئلے اور پالیسی پر ہم آواز ہوں ہے، صحیح نہیں ہے۔ اس لیے میں آپ سے درخواست کروں گا کہ جو افراد یہ کہتے ہیں کہ اپنے ضمیر کی بنا پر اور ان وعدوں کی بنا پر، جو انہوں نے اپنے حلقۂ انتخاب سے کیے ہیں اور جس کی بنا پر وہ ایوان میں آئے ہیں، اگر وہ پارٹی قیادت سے اختلاف کرتے ہیں تو یہ اختلاف ان کا حق ہے۔ اسے 'لوٹا کریسی' نہیں کہا جا سکتا۔ اسے پارٹی ہی کے اندر گروپ تسلیم کیا جائے گا اور ان کو حق رائے دہی سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اس سے مجھے اتفاق ہے کہ ذاتی مفادات کے حصول کے لیے ایسا کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسی طرح یہ سرخ لکیر دستور میں واضح کر دی گئی ہے اسے عبور کرنے کا حق بھی کسی رکن کو نہیں دیا جا سکتا۔ اس پر میں آگے بھی بات کروں گا۔

جنابِ والا! ساتھ ہی میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اگر ایک گروپ نے کسی خاص الیکشن سے پہلے اپنی حیثیت کا اعلان کر دیا اور اس طرح تمام متعلقہ مقامات پر مطلع کر دیا تو یہ

بڑی اہم چیز ہے۔ میرے علم کی حد تک مسلم لیگ کے ہم خیال گروپ نے اس وقت بھی، جب کہ (ق لیگ) اپوزیشن میں تھی، اپنے قائد سے اختلاف کیا۔ میرے پاس وہ دستاویز ہیں جن میں ۲۰۰۹ء میں وہ ہائی کورٹ میں گئے ہیں اور اسی بنیاد پر گئے ہیں۔ جنابِ والا! میں کوئی فیصلہ نہیں دے رہا، میں صرف آپ کے سامنے حقائق رکھ رہا ہوں کہ پارٹی قیادت نے ان کے خیال میں پارٹی کے دستور سے انحراف کیا۔ اس بنا پر انہوں نے ان کو چیلنج کیا اور اپنے آپ کو پارٹی کے دستور، مقاصد اور منشور کے محافظ کی حیثیت سے اس وقت بھی پیش کیا جبکہ وہ اپوزیشن میں تھے۔ آپ نے ان کو تسلیم کیا۔ اگر بعد میں پارٹی حکومت میں شریک ہو گئی ہے اور ہم خیال نے اپنی شناخت باقی رکھی ہے تو یہ اس کی جائز شناخت تھی۔ اسے ہم نے اس سے پہلے تسلیم کیا ہے اور اس کا تسلسل ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس بناء پر میں چاہتا ہوں کہ آپ کے سامنے یہ امتیاز رہے کہ اپوزیشن میں، خواہ وہ مسلم لیگ (ق) کے ہوں، یا 'ہم خیال' کے اور یا وہ کسی دوسری پارٹی کے ہوں، اگر وہ اپوزیشن میں ہیں تو ان کو ووٹ کے حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کیا گیا ہے تو یہ زیادتی ہوئی ہے، جس کی تلافی ہونی چاہیے۔

آئین کی رو سے سیاسی جماعتوں میں نظم وضبط: جناب چیئرمین! میں اس کے بعد آپ کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ اگر آپ ۱۴ویں، ۱۷ویں اور ۱۸ویں آئینی ترامیم کا آرٹیکل ۶۳ (اے) سے موازنہ مطالعہ کریں تو ہمارے ملک میں سیاسی جماعتوں کے نظام یا ڈسپلن کے سارے دائرے آپ کے سامنے آجاتے ہیں۔ اگر مجھے صحیح یاد ہے تو سیاسی جماعتوں کے قانون میں پہلی مرتبہ جماعت سے علیحدگی کے مسئلے کو ۱۹۸۶ء میں شامل کیا گیا ہے۔ اس کے بعد پھر ۱۹۹۰ء میں ۶۴ (اے) میں ۱۴ویں آئینی ترمیم کے موقع پر اس مسئلے کو لیا گیا ہے۔ میں چاہوں گا کہ آپ ۱۴ویں آئینی ترمیم نکال کر ضرور دیکھیں، اس لیے کہ اس کے اندر جماعتوں پر ایک ایسا سخت نظم وضبط لاگو کیا گیا ہے جس کے نتیجے کے طور پر سیاسی جماعتوں میں جو رنگا رنگی اور لچک ہونی چاہیے، اور جو پارلیمانی تاریخ کا اہم حصہ ہے، وہ اس کے اندر مفقود ہو گئی۔

تاہم یہ بات اہم ہے کہ ۱۷ویں آئینی ترمیم نے ۱۴ویں آئینی ترمیم کو ختم کر دیا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ مقننہ نے ایک شعوری فیصلے کے ذریعے ڈسپلن کا وہ تصور جو ۱۴ویں آئینی ترمیم میں دیا گیا تھا، مسترد کیا ہے۔ پھر ۱۸ویں ترمیم میں ۱۷ویں ترمیم کے تصور کو تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ قبول کیا گیا۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ۱۷ویں اور ۱۸ویں ترامیم میں وضاحت سے رکھے گئے چار مسائل کو چھوڑ کر اخراج نہیں بنتا۔ ان چار میں ایک بنیادی ہے، جو سینیٹ سے متعلق ہے، یعنی پارٹی کو چھوڑ کر کسی اور پارٹی کو اختیار کرنا۔ باقی تین وہ ہیں جن کا تعلق صرف اسمبلی سے ہے، سینیٹ سے نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہاں لیڈر آف دی ہاؤس نہیں ہوتا اور یہاں منی بل نہیں آتا ہے۔ دستوری ترمیم البتہ یہاں آتی ہے۔ اس بنا پر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اب جو سرخ لکیر ہے، وہ سرخ لکیر خیالات کی نہیں ہے۔ وہ سرخ لکیر بیان کیے گئے صرف ان چار مسائل کے متعلق ہے اور یہ ۱۸ویں ترمیم کی بنا پر پارلیمنٹ کا ایک شعوری فیصلہ ہے جس میں اس نے اس تصور کو مسترد کیا ہے جو ۱۴ویں ترمیم میں تھا۔ اس بنا پر آپ کو اس وقت کے جو حقائق ہیں ان کو سامنے رکھ کر اس مسئلے کو طے کرنا ہو گا۔

جناب چیئرمین! میری ان معروضات کا حاصل یہ ہے کہ اپوزیشن پارلیمنٹ کا لازمی حصہ اور ہماری روایت ہے اور اگر اپوزیشن نہ ہو تو یہ ہاؤس ٹھیک طریقے سے کام نہیں کر سکتا۔ دوم یہ کہ اپوزیشن سے کون متعلق ہے یہ غیر یقینی، مبہم اور خیالی چیز نہیں ہے۔ یہ ایک پارٹی بھی ہو سکتی ہے اور یہ ایک سے زیادہ جماعتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ جو افراد اپنے آپ کو اپوزیشن کی حیثیت سے متعارف کریں، ان کا یہ حق ہے کہ انہیں اسی طور قبول کیا جائے اور اس ہاؤس نے ان کے اس حق کو تسلیم کیا ہے۔ اس ڈھانچے کے اندر ان کے جو حقوق ہیں ان حقوق سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے ساتھ ہی ایک اور اہم نکتہ کی طرف میں آپ کو متوجہ کروں گا اور وہ یہ ہے جناب چیئرمین! کہ جہاں تک اس ایوان کا تعلق ہے، میں ۱۹۸۵ء سے آج تک، الحمدللہ، اپوزیشن میں ہوں۔ میری زندگی میں ان ۲۱ سالوں میں کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں کہ میں

سرکاری بنچوں پر گیا ہوں۔

جب ۲۰۰۳ء کے انتخابات کے بعد اپوزیشن کا ایک خاص رنگ بنا تو اس وقت دو بڑے بڑے غیر حکومتی گروپ تھے۔ ایک جسے مشترکہ اپوزیشن کہتے تھے جس میں ایک سے زائد گروپس شامل تھے اور دوسرا ایم ایم اے۔ پہلے میں بائیس افراد تھے اور دوسرے میں اکیس افراد تھے۔ اکیس ارکان کی بنیاد پر ہم سب سے بڑی پارٹی تھے لیکن ہمیں قائدِ حزبِ اختلاف کا عہدہ نہیں دیا گیا اور ہم نے اسے کسی تنازعہ کے بغیر قبول کیا۔ ہم نے کہا کہ ٹھیک ہے مشترکہ اپوزیشن میں اگرچہ کئی عناصر شامل ہیں لیکن بطور گروپ ان میں ایک فرد ہم سے زیادہ ہے۔ جب میاں رضا ربانی کو اپوزیشن لیڈر مقرر کیا گیا تو میں نے خود کھڑے ہو کر اپنی پوری حمایت کا یقین دلایا۔ وہ مہربانی سے میرے گھر آئے اور اس کے بعد سے ہم نے متحدہ اپوزیشن اور آزاد حیثیت کے ساتھ دونوں طرح کام کیا ہے۔

۲۰۰۸ء کے انتخابات کے بعد صورت حال تبدیل ہوئی اور جب میاں رضا ربانی صاحب کو قائدِ ایوان بنایا گیا تو اس وقت بزنس کمیٹی میں آپ کی صدارت میں، تمام پارٹیوں کی موجودگی میں، جس میں اس وقت کی حکومت بھی شامل تھی اور اپوزیشن بھی تھی، یہ بات طے کی گئی تھی۔ اس وقت ہم گیارہ افراد تھے جو اپنے آپ کو پی ایم ایل (ق) کی اپوزیشن قیادت سے منسلک نہیں کر رہے تھے۔ چنانچہ ہمارے بھائی وسیم سجاد صاحب اپوزیشن لیڈر بنائے گئے لیکن ہم نے آزاد حیثیت کو قائم رکھا۔ گیارہ افراد کے اس گروپ میں جماعتِ اسلامی کے چھ افراد تھے اور ہمارے ساتھ پانچ ارکان دوسری پارٹیوں کے تھے تو گیارہ افراد کو بطور آزاد گروپ تسلیم کیا گیا۔ آپ نے ہمیں کچھ سہولیات دیں اور ہم نے الحمدللہ ان کا کبھی غلط فائدہ نہیں اٹھایا۔ جب پی ایم ایل (ن) حکومت سے باہر آئی تو انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ہمارے ساتھ مل کر چلیں اور ہم نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اس طرح ہم تیرہ ہو گئے اور میں نے اس گروپ کی ۲۰۰۸ء سے ۲۰۰۹ء تک قیادت کی۔

۲۰۰۹ء کے الیکشن میں مسلم لیگ (ن) کے اور ممبران آ گئے، ان کی تعداد سات

تھی۔ اس وقت ہم نے راجہ ظفر الحق صاحب کو قائدِ حزبِ اختلاف بنایا اور ہم اپنے اختلافات کے ساتھ مشترکات کی بنیاد پر ایک گروپ کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ہمارے تمام ارکان نے جو فیصلہ اس وقت کیا وہ ایک گروپ کی حیثیت سے کیا، کسی فرد کی حیثیت سے نہیں کیا۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ حقائق آپ کے سامنے رہیں۔

اس کے بعد جب پی ایم ایل (ق) حکومت میں چلی گئی تو پھر پی ایم ایل (ق) کے وہ ارکان جو ہم خیال تھے اور وہ افراد جنہوں نے پی ایم ایل (ق) کی اس حیثیت کو تسلیم نہیں کیا، انہوں نے ہمیں پیش کش کی کہ ہم آپ کے ساتھ مل کر چلنا چاہتے ہیں۔ یہ میں آپ کو الیکشن سے پہلے کی بات بتا رہا ہوں۔ ہم نے کہا کہ ' چشم ما روشن دلِ ماشاد ' اور اس طرح مشترکہ حزبِ اختلاف گروپ میں ہم چوبیس یا پچیس افراد بن جاتے ہیں۔ یہ ساری بات سب لوگوں کو معلوم ہے۔ یہ کوئی خیالی اور مبہم چیز نہیں ہے اور یہ محض ووٹنگ کے لیے اور لیڈر بنانے کے لیے آج نہیں بنائی گئی ہے۔ ہم نے گروپ اس وقت نہیں بنایا ہے بلکہ یہ حقیقت ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ یہ حقائق بھی آپ کے سامنے رہیں اور نظری پوزیشن بھی آپ کے سامنے رہے۔

اس کے بعد آپ یہ دیکھیں کہ فی الحقیقت اپوزیشن کیا ہے؟ میں یہ بھی کہہ دوں کہ جب جے یو آئی حکومت سے الگ ہوئی، انہوں نے آپ سے بار بار مطالبہ کیا کہ انھیں سینیٹ میں الگ نشستیں دی جائیں۔ چار پانچ مہینوں تک انہیں نشستیں نہیں ملیں لیکن اس پورے زمانے میں انہوں نے ہم سے یہ نہیں کہا کہ ہم آپ کے ساتھ مل کر ایک اپوزیشن گروپ بنانا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے جب یہ صورت حال پیدا ہوئی، ان کی سیٹیں بھی الگ ہو گئیں۔ الیکشن کا موقع آیا تو اسی طرح ایک گروپ کی حیثیت سے انہوں نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ اس لیے ان حقائق کو سامنے رکھ کر آپ اپنی رائے تشکیل کریں اور اس تصوراتی ڈھانچے کو بھی سامنے رکھیں جسے میں نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔

آزاد اراکین کی پوزیشن

جنابِ والا! اب میں آزاد اراکین کے بارے میں نکتہ پیش کروں گا جو میری نگاہ میں بڑا اہم ہے۔ دیکھیں پارلیمانی جمہوریت جب سے پارٹی سسٹم پر بنی ہے، اور اب اس کو بنے کم از کم دو سو سال ہو گئے ہیں، اس میں آزاد اراکین کو ایک مقام حاصل ہے۔ لیکن میرے علم کی حد تک ان آزاد اراکین کے سوا، جنہوں نے اپنے آپ کو حکومت سے یا اپوزیشن سے وابستہ کر لیا ہے، انہیں کبھی بھی اپوزیشن کا حصہ تسلیم نہیں کیا گیا۔ آزاد اراکین کے معنی ہی یہ ہیں کہ نہ صرف یہ کہ وہ آزاد منتخب ہو کر آیا ہے بلکہ انتخاب کے بعد بھی اس کی کسی پارٹی سے وابستگی نہیں ہے۔ لیکن اگر اس نے منتخب ہونے کے بعد کسی پارٹی سے وابستگی کر لی ہے تو وہ پارٹی کا حصہ ہے، اس کی علیٰحدہ اور آزاد حیثیت باقی نہیں رہی۔ البتہ اگر پارٹی سے وابستگی نہیں کی ہے تو بطور رکن اس کے حقوق ہیں اور وہ سارے حقوق اس کو دیے جانے چاہییں۔ لیکن در حقیقت وہ اپوزیشن کا ممبر نہیں بنے گا۔ اس معاملے میں، میں آپ کی توجہ مبذول کراؤں گا جسے آپ ضرور دیکھیں اور آپ چاہیں گے تو میں آپ کو اس کی کاپی دوں گا۔ یہ Inter-Parliamentary Union (IPU) کی بہت اہم سرکاری کتاب Parliaments of the World ہے اور یہ دو جلدیں ہیں۔

اس کتاب میں دنیا کی ۸۰ پارلیمنٹس کی پوری تفصیلات موجود ہیں۔ میں آپ کو اس کی کاپی بھی دے دوں گا اور سینیٹ لائبریری میں بھی یہ کتاب موجود ہے۔ اس کا ٹیبل ۱۹ خاص طور پر بہت اہم ہے۔ اس ٹیبل میں دنیا کے مختلف وساتیر سے تجزیہ کر کے انہوں نے دکھایا ہے کہ پارٹی پوزیشن کیا ہوتی ہے۔ اس ٹیبل میں (۱) ملک کا نام (۲) گروپ کی شناخت اور نام (۳) شناخت کی قانونی وجہ (۴) شناخت کی شرائط (۵) شناخت کرنے والی اتھارٹی کی تفصیل دی گئی ہے۔

اس کے بعد بہت اہم یعنی (الف) حزبِ اختلاف کا تعین، (ب) حزبِ اختلاف اور گروپوں کے حقوق اور سہولتیں بیان کی گئی ہیں اور پھر (ج) غیر وابستہ اراکین کے حقوق ہیں۔

دنیا کی ساری پارلیمنٹس میں تین گروپ شمار کیے جاتے ہیں۔ ایک حکومت، خواہ وہ ایک پارٹی کی ہو یا پارٹیوں کا مجموعہ، دوسرا حزبِ اختلاف، خواہ متعینہ ایک پارٹی ہو یا مخلوط، اور تیسرا وہ جو ان دونوں میں کسی کے ساتھ بھی وابستہ نہیں ہے اور اس کے لیے لفظ بھی بڑا اہم استعمال کیا گیا ہے، غیر وابستہ۔ اور غیر وابستہ کا یہی لفظ آزاد اراکین کے لیے آپ کو Kaul میں بھی ملے گا۔ ان کے حقوق ہیں اور Kaul میں وہ سارے حقوق ملیں گے۔ لیکن ان کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپوزیشن کے ممبر شمار کیے جائیں یا اپوزیشن کے تنظیمی معاملات پر وہ ووٹ دیں یا اپوزیشن لیڈر کو منتخب کرنے میں ان کا کوئی کردار ہو گا۔

دنیا کی ان تمام پارلیمنٹس میں، جہاں غیر وابستہ اراکین ہیں، ان کے حقوق اسی طرح ہیں۔ بل پیش کرنے کے لیے ان کے حقوق ہیں، کام کے اجلاسوں میں، اگر وہ ایک گروپ ہیں، ان سے مشورہ کیا جائے گا۔ ان کا حق ہے کہ انہیں وقت دیا جائے، ان کا حق ہے کہ وہ کمیٹی کے نمائندہ ہوں لیکن ان کا یہ حق نہیں ہے کہ انہیں اپوزیشن کا حصہ مانا جائے اور اپوزیشن لیڈر کا انتخاب ان کے ووٹ سے ہو یہ حق ان کو حاصل نہیں ہے۔ یہ بالکل واضح چیز ہے، جس میں دور و نزدیک کوئی اشتباہ نہیں ہو سکتا اور عقل بھی یہی کہتی ہے۔ چنانچہ مثلاً جن آزاد اراکین نے، خواہ ان کا تعلق فاٹا سے ہو یا بلوچستان سے ہو یا کسی اور جگہ سے، اپنے آپ کو حکومت یا حزبِ اختلاف میں سے کسی کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے، مثلاً نو ممبران نے حکومت کا ساتھ دیا، دو نے جے یو آئی کا ساتھ دیا، اگر انہوں نے یہ کر دیا ہے تو اب وہ ان کا حصہ ہیں، اب وہ آزاد اراکین نہیں رہے۔ لیکن اگر وہ اپنے آپ کو آزاد اراکین سمجھتے ہیں اور اس کا اعلان کرتے ہیں، تب وہ کسی بھی پہلو سے اپوزیشن کا حصہ نہیں بنتے۔ اگر ان کو اپوزیشن کا حصہ بنایا گیا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ مستقبل میں اپوزیشن کا لیڈر کبھی بھی اپوزیشن کی نمائندگی نہیں کرے گا۔ بلکہ وہ اسے تھالی کا بینگن بنائیں گے اور اس طرح جماعتی جمہوریت کا جو تصور ہے اور اس میں اپوزیشن کا جو تصور ہے، وہ تباہ ہو جائے گا۔

اس پس منظر میں، میں پوری قوت کے ساتھ یہ بات آپ سے کہنا چاہتا ہوں اور

پوری دیانتداری سے کہہ رہا ہوں کہ آپ دنیا کے سارے دساتیر کا مطالعہ کر لیں، آپ کو کہیں بھی غیر وابستہ آزاد رکن نہ اپوزیشن کا ممبر نظر آئے گا نہ حکومت کا۔ اِلّا یہ کہ جنہوں نے اعلان کر کے اپنی اس حیثیت کو ختم کر کے اپنے آپ کو ان میں سے کسی میں شامل کر لیا ہو۔

جناب چیئرمین! اس وقت اس ایوان میں تین قسم کے آزاد اراکین سامنے آرہے ہیں۔ ایک تو وہ آزاد ہیں، جن کو آپ کہہ سکتے ہیں کہ جنہوں نے پارٹی سے وابستگی اختیار کر لی۔ ایک وہ آزاد ہیں جنہوں نے کسی پارٹی سے وابستگی کی ہی نہیں ہے۔ ایک وہ آزاد ہیں جنہوں نے کسی پارٹی سے وابستگی کر کے وابستگی کو تبدیل کر لیا ہے۔ میرے خیال میں ہمیں ان تینوں پہلوؤں کو نظر میں رکھنا پڑے گا۔ لیکن میری عرض یہ ہے کہ جنہوں نے اپنے آپ کو کسی سے وابستہ نہیں کیا، وہ بہر حال آزاد ہیں اور وہ آزاد رہیں گے۔ ان کے ایک رکن کی حیثیت سے حقوق ہیں لیکن وہ نہ حکومت کا حصہ ہیں اور نہ اپوزیشن کا حصہ ہیں۔

دوسری جانب جنہوں نے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا ہے، اب وہ آزاد یا غیر وابستہ نہیں ہیں۔ وہ حکومت کا یا اپوزیشن کا حصہ بن گئے ہیں۔ جو اپنے آپ حکومت میں یا اپوزیشن میں شامل ہو کر اپنی وابستگی کو بدلتے ہیں انہیں اپنے آپ کو بدلنے کا حق ہے۔ میں آزاد اراکین کے حق کو سلب نہیں کرنا چاہتا لیکن یہ ضرور دیکھا جائے گا کہ ان کی حیثیت میں یہ تبدیلی بدنیتی اور بدیانتی کی بناء پر ہے یا دیانتداری ہے۔ یہ کب ہوا ہے؟ کس مقصد سے ہوا ہے؟ اصلی ہے یا مصنوعی ہے۔ پھر یہ ساری چیزیں دیکھنی پڑیں گی۔ جنابِ والا! اور اگر کسی خاص مسئلے پر یہ تبدیلی کی جاتی ہے تو یہ پھر وہ چیز ہو گی جسے 'لوٹا کریسی' کہا جا سکتا ہے۔ جس کا تعلق اصولوں سے نہیں ہو گا البتہ بعض استثنائی صورتوں میں یہ اصولی بھی ہو سکتا ہے۔ میں بہر حال اس سے انکار نہیں کرتا۔ یہ انفرادی کیسوں پر منحصر ہے اور آپ کو اس کی میرٹ پر جانچ کرنا ہو گی۔

حاصلِ گفتگو

جنابِ والا! میں اپنی بات کو ختم کرتا ہوں۔ پہلی چیز یہ ہے کہ چیئرمین کو رولنگ دینے

کا حق ہے اور اگر رولنگ میں ٹھوس خامیاں رہ گئی ہوں تو اس پر نظر ثانی ہونا چاہیے۔ یہ انصاف کا تقاضا ہے اور آپ نے یہ کام کر کے عظمت کا ثبوت دیا ہے۔ اس رائے میں تین سقم تھے جنہیں میں نے پیش کر دیا ہے جن کو آپ درست کر دیں۔

دوسری چیز یہ کہ مسلم لیگ (ق) کے جن افراد کی اپوزیشن کے ساتھ وابستگی ہے وہ اس کا حصہ ہیں، اس کا حصہ تھے اس کا حصہ رہنا چاہتے ہیں۔ یہ ان کا حق ہے اور کسی پارٹی کے قائد کو یہ حق نہیں کہ ان کو ووٹ کے حق سے محروم کرے۔ پارٹی قائد کو ایک حق ہے اور وہ یہ کہ اگر اس کی نگاہ میں کوئی رکن پارٹی سے انحراف کے مرتکب ہوئے تو وہ پارٹی سے انحراف کی کارروائی کر سکتا ہے اور اس معاملے میں بھی دستور نے واضح کہہ دیا ہے کہ؛ نمبر ا، انہیں شوکاز نوٹس دینا ہو گا؛ نمبر ۲، شوکاز نوٹس جن چار وجوہ کا دستور میں ذکر کیا گیا ہے ان کی بنیاد پر دینا ہو گا؛ نمبر ۳، انہیں دفاع کا حق حاصل ہے۔ یہ تینوں پارٹی کی سطح پر ہونے والے کام ہیں۔ اس کے بعد پارٹی لیڈر کا اختیار ہے کہ وہ چیئرمین یا صدر نشین جو چیئرمین یا اسپیکر ہو اسے مطلع کرے۔ چیئرمین یا اسپیکر کا یہ حق نہیں کہ وہ یہ طے کرے کہ اراکین نے پارٹی سے انحراف کیا یا نہیں۔ اس معاملے میں پارٹی لیڈر اور الیکشن کمیشن بااختیار ہیں۔

اور اگر ان حضرات کے خلاف کوئی نوٹس نہیں دیا گیا ہے، اگر ان کو شنوائی نہیں دی گئی ہے، اگر انہیں پارٹی سے منحرف ڈکلیئر نہیں کیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو پوزیشن ہے اس کو عملاً تسلیم کر لیا گیا ہے کہ یہ پارٹی سے بے وفائی نہیں ہے۔ یہ ان کا حق ہے کہ یہاں پر رہیں اور اس حق کی موجودگی میں ان کو ووٹ سے محروم کرنا آئین کے صریحاً خلاف اور اخلاقی اور سیاسی طور پر غلط ہے۔

تیسری چیز یہ کہ جس کو آزاد کہا جا رہا ہے وہ سر آنکھوں پر، لیکن پارلیمانی نظام کے اندر حکومت، اپوزیشن اور آزاد تین علیحدہ علیحدہ گروپ ہیں۔ اِلّا یہ کہ آزاد ارکان میں سے کسی نے پہلے دونوں گروپوں میں سے کسی ایک سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا ہو۔ اس صورت میں وہ پھر غیر وابستہ نہیں رہتا لیکن جو غیر وابستہ ہے وہ اپوزیشن میں ووٹ نہیں دے سکتا۔

اس لیے جن حضرات نے جے یو آئی کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کیا انہیں ووٹ کا حق حاصل ہے اور جنہوں نے اپنے آپ کو صرف آزاد ظاہر کیا انہیں ووٹ کا حق نہیں ہے۔ اس سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ کس طرح مستقبل میں اپوزیشن لیڈر کا تقرر قانون، دستور اور پارلیمانی روایات کے مطابق کیا جانا چاہیے۔ (۱۶ جون ۲۰۱۱ء)

پارلیمنٹ سے صدارتی خطابات پر تبصرے

دنیا کے مختلف ملکوں میں پارلیمانی روایات اور پاکستان میں آئین کے آرٹیکل ۵۶ کے تقاضوں کے مطابق صدرِ مملکت پارلیمانی سال کے آغاز پر پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کا اجلاس طلب کر کے خطاب کرتے ہیں۔ روایات کے مطابق اس خطاب میں قانون سازی کے حوالے سے حکومتِ وقت کا نئے سال کے لیے پروگرام پیش کیا جاتا ہے۔ جبکہ پارلیمنٹ کے اراکین اپنے تبصروں کے ذریعے حکومت سے وابستہ توقعات کا اظہار کرتے ہیں اور حکومتی پالیسیوں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں۔ پارلیمانی قواعد وضوابط کے مطابق اراکین پارلیمنٹ کے تبصروں کی شمولیت سے ہی صدر کے خطاب کی تکمیل ہوتی ہے۔

پروفیسر خورشید احمد صاحب کے ۶ صدارتی خطابات پر تبصرے قبل ازیں آئی پی ایس کی شائع شدہ کتب ''جمہوریت، پارلیمنٹ اور اسلام''، ''پاکستانی سیاست اور آئین'' اور ''آئین پاکستان: انحرافات اور بحالی کی جدوجہد'' میں شائع ہو چکے ہیں۔ چند سال ایسے ہیں جب صدرِ پاکستان نے پارلیمنٹ سے خطاب نہیں کیا جبکہ اِکا دُکا مواقع پر پروفیسر خورشید احمد نے ان پر تبصرہ نہیں کیا۔

کتاب کا یہ حصہ آئینی تقاضے کے مطابق پارلیمنٹ سے چار مختلف مواقع پر کیے گئے صدارتی خطابات پر پروفیسر خورشید احمد کے تبصروں پر مشتمل ہے۔

باب نمبر ۴

صدارتی خطاب: دعوے، حقائق اور لائحہ عمل

[جنرل پرویز مشرف کے خطاب پر تبصرہ (۲۰۰۴ء)]

۱۶ جنوری ۲۰۰۴ء کو پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے بطور صدرِ پاکستان آئینی تقاضے کے مطابق جنرل پرویز مشرف نے خطاب کیا۔ اس تقریر میں صدر پرویز مشرف نے ملکی ترقی، خود انحصاری، توانائی، قدرتی وسائل اور محنت کش افرادی قوت کی موجودگی کا حوالہ دیا۔ ساتھ ساتھ ملکی سطح پر کرپشن اور قومی اداروں کی نااہلی کا تجزیہ کیا۔ صدر پرویز مشرف کی تقریر کا اہم ترین جزو ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ اور افغانستان اور کشمیر کے حوالے سے پاکستان پر لگنے والے انتہاپسندی اور دہشت گردی کے الزامات تھے۔ انہوں نے اس صورت حال سے نکلنے کے لیے دنیا کو یقین دلایا کہ ہم ذمہ دار قوم ہیں اور قوم سے اپیل کی کہ وہ فرقہ پرستوں اور انتہاپسندوں کے خلاف جہاد شروع کر دیں۔

صدر پرویز مشرف نے بحالی جمہوریت کے حوالے سے مثبت اشارے دیے اور اختیارات کی نچلی سطح پر منتقلی اور بدعنوانی کے خلاف احتساب کا یقین دلایا۔

صدرِ مملکت کے پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے سالانہ خطاب پر ۲۰ فروری ۲۰۰۴ء کو اراکین پارلیمنٹ کی جانب سے پروفیسر خورشید احمد نے بحث کا آغاز کیا۔

جناب چیئرمین، میں آپ کا بے حد ممنون ہوں اور میں اس کو اپنے لیے ایک اعزاز سمجھتا ہوں کہ اس معزز ایوان میں صدر جنرل پرویز مشرف کے خطاب پر بحث کا آغاز کر رہا ہوں۔ جنابِ والا! سب سے پہلے تو میں یہ بات ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ صدر کا خطاب ایک

سال کی تاخیر سے ہوا[1]۔ دستور اس معاملے میں بہت واضح ہے کہ:

> ہر عام انتخابات کے بعد قومی اسمبلی کے پہلے اجلاس اور ہر سال کے پہلے اجلاس کے آغاز پر صدرِ مملکت دونوں ایوانوں کا مشترکہ اجلاس طلب کریں گے اور مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کو اپنے اجلاس طلب کرنے کی وجوہات سے آگاہ کریں گے۔

صدارتی خطاب: آئین اور پارلیمانی روایات

دوسری بات یہ ہے کہ تاخیر سے کیے جانے والے اس خطاب میں بھی دستور کا یہ تقاضا پورا نہیں کیا گیا کہ صدر ایوان کو بتائے گا کہ پارلیمنٹ کا اجلاس کیوں بلایا گیا ہے۔ دستور کی متعلقہ شق کے یہ الفاظ اہم ہیں لیکن مجھے یہ بات دکھ سے کہنی پڑتی ہے کہ صدر صاحب کے پورے خطاب اور کمانڈو ایکشن کے باوجود دستور کا یہ تقاضا آج بھی پورا ہونا باقی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر میں یہ کہوں کہ اصل خطاب ابھی ہوا نہیں بلکہ ہونا ہے تو اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہوگا۔ وہ آئے، انہوں نے تقریر بھی فرمائی اور مکے بھی دکھائے لیکن اس اہم پہلو پر کوئی بات نہیں کی۔

صدر کے خطاب کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے تین ہی حصے ہیں: ایک دعوے، دوسرے الزامات اور پھر کچھ نصیحتیں۔ کوئی چوتھی چیز آپ اس کے اندر سے نہیں نکال سکتے۔ گویا کہ جس مقصد کے لیے یہ خطاب ہونا تھا، یعنی پارلیمنٹ کو یہ بتایا جائے کہ اس کے سامنے قانون سازی کا، پالیسیوں کی تشکیل کا اور یا ملک کے وسائل کے سلسلے میں اس سال کا ایجنڈا کیا ہے، اس پر کوئی بات ہی نہ ہوئی۔ حکومت اس خطاب کے ذریعے سے اپنا سال بھر کا پروگرام پارلیمنٹ کے سامنے لاتی ہے۔ یہی اس کا مقصد ہے اور یہ مقصد حاصل نہیں ہوا۔ گویا ہم گئے تھے عرض کرنے مدعا اور عرض مدعا ہی نہ ہوا۔

---

[1] ۲۰۰۲ء میں قومی انتخابات اور نئی حکومت کے قیام کے بعد صدر کا پہلا خطاب ۲۰۰۳ء میں ہونا چاہیے تھا۔

اس کے بعد میں یہ کہنا چاہتا ہوں جنابِ والا! کہ صدر صاحب کے خطاب کا جو اسلوب اور انداز ہے وہ بھی پارلیمانی روایات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ وہ صدر کا نہیں بلکہ چیف ایگزیکٹو کا خطاب تھا۔ جو تبدیلی ۲۰۰۲ء کے انتخابات کے بعد واقع ہو چکی ہے اور جس کا انہیں اعتراف ہونا چاہیے، اس کی کوئی جھلک ان کے خطاب میں نظر نہیں آتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک بڑی نامناسب اور غلط روایت قائم ہوئی ہے۔ انہیں جاننا چاہیے کہ اب وہ چیف ایگزیکٹو نہیں ہیں کہ جو چاہیں کہہ ڈالیں بلکہ انھیں اب ۲۰۰۲ء میں انتخاب کے نتیجہ میں قائم ہونے والی ایک حکومت کے نمائندے کے طور پر بات کرنی ہے۔ انھیں کابینہ کے بتائے ہوئے لائحہ عمل کو پارلیمنٹ کے سامنے اس کے غور و فکر کے لیے پیش کرنا ہے۔

صدر کے دعوے اور ان کی حقیقت

پھر جنابِ والا! انھوں نے کچھ دعوے کیے۔ میں نے ان کا پورا خطاب پڑھا ہے۔ میں اس اجلاس میں شریک تھا اور احتجاج کر کے واک آؤٹ کرنے والوں میں بھی شریک تھا۔ میں نے خطاب کو سنا بھی ہے اور پڑھا بھی ہے۔ یہ بات میں بہت دکھ اور ذمہ داری سے بیان کر رہا ہوں کہ ان کا یہ کہنا کہ میں نے جتنے وعدے قوم سے کیے تھے سب پورے کر دیے اور ان میں سے آخری وعدہ جمہوریت کی بحالی کا تھا اور وہ بھی پورا ہو گیا، اس سے زیادہ بڑا مذاق قوم کے ساتھ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ جتنے دعوے انہوں نے کیے تھے بلاشبہ ان کا پوری دیانتداری کے ساتھ جائزہ لیا جانا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ وہ اچھی حکمرانی دے سکے ہیں اور نہ کرپشن دور ہو سکی ہے۔ معاشی ترقی کا ایک درمیانی معاملہ ہے جو ہمارے سامنے آیا ہے لیکن سب سے اہم چیز یہ ہے کہ ملک کی آزادی، حاکمیت، خود مختاری، خود کفالت، خود انحصاری شدید طور پر متاثر ہوئی ہیں۔ یہ وہ بڑے بڑے حادثے ہیں جو اس عرصہ میں ان کی کارکردگی کا حصہ ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہم نے اس زمانے میں اپنی آزادی اور خود مختاری کو مجروح کر دیا ہے۔

بحالی جمہوریت کا مسئلہ: جہاں تک جمہوریت کا معاملہ ہے تو مجھے پورے ادب سے یہ کہنے کی

اجازت دیجیے کہ انہوں نے اس کا جو رُخ پیش کیا ہے اسے کسی اعتبار سے بھی دستور اور اسلامی جمہوریت کے مسلمہ اصولوں کے مطابق قرار نہیں دیا جاسکتا۔ جمہوریت کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جمہوریت کی بحالی نہیں کی گئی۔ بلاشبہ ہم نے حالات کو سنبھالنے کے لیے ۱۷ویں ترمیم کا راستہ اختیار کیا اور اس کا مقصد صرف ایک ہے کہ کسی طرح یہ ملک آئین اور قانون کی پٹڑی پر آجائے اور ہم آگے بڑھ سکیں۔ لیکن یہ دعویٰ کہ جمہوریت بحال ہو گئی یہ غلط ہے۔ جب تک فوج کا کردار جو دستور میں لکھا ہوا ہے وہ دستور کے مطابق نہیں ہوتا، جب تک پارلیمنٹ کی بالادستی بحال نہیں ہوتی، جب تک تمام ادارے جن کے ذریعے سے کوئی بھی نظام چلتا ہے وہ اپنے دائرے میں اور صحیح صحیح خطوط پر کام نہیں کرتے، ملک میں جمہوریت کی بحالی ممکن نہیں ہے۔ اور جیسا کہ میں آخر میں اپنی گفتگو میں کہوں گا کہ پارلیمنٹ کے سامنے جو اصل ایجنڈا ہے وہ جمہوریت کی بحالی ہے، وہ ملک کے بنیادی مسائل کو حل کرنے کے لیے صحیح پالیسی سازی اور اس کے لیے صحیح تجاویز مرتب کرنا ہے جن سے ان کا خطاب یکسر خالی ہے۔

میں جنابِ والا! یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ جمہوریت کے لیے اس وقت سب سے بڑا خطرہ دہری حاکمیت ہے۔ یعنی پارلیمانی اختیارات کا منبع پارلیمنٹ ہوتی ہے جس کا نمائندہ کابینہ اور وزیراعظم ہیں۔ بلاشبہ سیاسی میدان میں ہم اس وقت وزیراعظم اور ان کی پارٹی کے خلاف ہیں لیکن پارلیمنٹ کی بالادستی ہمارا مشترکہ ایجنڈا ہے۔ پارلیمنٹ کے نظام کے اندر فیصلے کرنے، پالیسی تیار کرنے اور اس کے اعلان کا اختیار وزیراعظم اور کابینہ کو ہوتا ہے، صدر کو نہیں ہوتا۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ۱۷ویں ترمیم کے بعد کچھ غیر معمولی اختیارات صدر کو ملے ہیں لیکن جس طرح وہ نظام کو چلا رہے ہیں وہ اس سے بہت متجاوز ہیں۔ پارلیمان، کابینہ اور وزیراعظم کو گرہن لگا کر وہ پارلیمانی نظام کو ایک قسم کے صدارتی نظام میں تبدیل کرنا چاہ رہے ہیں۔ یہ وہ ساری چیزیں ہیں جن پر ہمیں توجہ دینا ہے۔ ان کے خطاب میں جمہوریت کی بحالی کے اس دعویٰ کی میں مکمل طور پر تردید کرتا ہوں۔ ان کا یہ دعویٰ سراسر غلط اور حقائق کے خلاف ہے۔

ملک کو درپیش خطرات: صدر نے اپنے خطاب میں اقبال اور قائداعظم کے خواب کا ذکر بھی کیا ہے اور سچی بات یہ ہے کہ ان دونوں عظیم راہنماؤں کا اس ملک اور اس قوم پر بہت بڑا احسان ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقبال اور قائداعظم نے پاکستان کے لیے جو تصور دیا تھا، مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ پچھلے چار سالوں میں اس تصور کو پارہ پارہ کرنے کا کام جنرل پرویز مشرف صاحب اور ان کے رفقاء نے انجام دیا ہے۔ اس تصور میں سب سے بنیادی چیز یا اصول کیا تھا؟ یہ کہ ہم نے یہ آزادی کسی فوجی کارروائی سے حاصل نہیں کی، یہ جمہوری طریقے سے حاصل ہوئی ہے اور عوام اس کے اصل امین ہیں لیکن آج ہم نے اپنی آزادی امریکہ کے ہاتھوں گروی رکھ دی ہے۔ نائن الیون کے واقعہ کے بعد ہم نے خوف کے تحت ڈر کر پسپائی کے بعد پسپائی اختیار کی ہے اور عالم یہ ہے کہ معیشت ہو، سیاست ہو، خارجہ پالیسی ہو اور یا فوجی کارروائیاں، حتّٰی کہ اب خطرہ یہ ہے کہ ایٹمی ڈاکٹرائن/پالیسی اور اس کی سلامتی کے معاملات، سب کے اندر امریکہ کی مداخلت کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ بلاشبہ یہ ہمارے سامنے سب سے بڑا خطرہ ہے۔

اسلامی فلاحی ریاست کا قیام: جنابِ والا! اسلام کے بارے میں یہ بات کہی گئی کہ اسلامی فلاحی ریاست کا قیام ہمارا مقصد ہے۔ بلاشبہ ہے اور یہی اس امت کی، اس قوم کی تمنا ہے۔ آزادی کی تاریخی جدوجہد کا تقاضا بھی یہی ہے۔ لیکن اسلام کے ساتھ آپ اس وقت کیا رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں؟ ہمارا رویہ معذرت خواہانہ ہے۔ ہمارا طرز عمل یہ ہے کہ ہر اصول، ہر قدر/روایت کے لیے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ امریکہ کیا کہہ رہا ہے۔ جو چیز امریکہ کو ناپسند ہے اس کے لیے یا معذرت کرتے ہیں اور یا اس پر نظر ثانی۔ جنابِ والا! آج جدید اسلام، جدت پسند اسلام اور جدیدیت پر مائل اسلام کی آوازیں بلند کی جارہی ہیں۔ جنابِ والا! مجھے اجازت دیجیے اور میں یہ بات پوری قوت سے کہنا چاہتا ہوں کہ اسلام ہی اعتدال کا مذہب ہے اور اسلام سے زیادہ جدید کوئی طریق زندگی نہیں ہے۔ لیکن ہماری ساری جدیدیت اور آزاد روی اسلام کے دائرے کے اندر ہے۔ اسلام کو دوسروں کی خواہشات اور مطالبوں کی روشنی میں

تراشا خراشا، ان سے پسپائی اور انہیں خوش کرنے کے لیے اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر مصالحت کا نام جدیدیت نہیں ہے، یہ تو اسلام کی نگاہ میں انحراف اور بغاوت ہے۔

جنابِ والا! میں یہ بات صاف کہنا چاہتا ہوں کہ جو رویہ ہم نے اختیار کیا وہ اسلام پر اعتماد اور اسلام کے مطابق اپنے مؤقف کا برملا اظہار نہیں ہے بلکہ ہم ہر چیز کے لیے واشنگٹن اور واشنگٹن کے انتہا پرستوں کی طرف دیکھ رہے ہیں کہ وہ انتہا پرست آج کیا بات کر رہے ہیں۔ جو چیزیں وہاں پر میڈیا کہتا ہے، ہم اس کی بازگشت بن جاتے ہیں۔ اسلام کے ساتھ اس سے زیادہ بڑا ظلم اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ جنابِ والا! میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ اسلام اس بات کا نام ہے کہ انسان اللہ کی مرضی کے تابع ہو جائے، جس بات کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے طے کیا ہے اسے ہم قبول کریں اور اسی میں اپنی نجات دیکھیں۔ اسلام کے نزدیک روشن خیالی یہ نہیں ہے کہ نماز کا وقت ہے تو اپنے آپ کو روشن خیال دکھانے کے لیے میں نماز نہ پڑھوں، اسلام کے لباس کے جو آداب ہیں، میں ان کا لحاظ نہ رکھوں، روزہ بھی نہ رکھوں اور کھانے کے معاملے میں حرام اور حلال کی تمیز نہ کروں۔ اسلام تو نام ہی حلال و حرام کی تمیز کا ہے۔ جدیدیت جو بھی ہے ہمارے لیے وہ اسلام کے اندر ہے، اسلام کے باہر نہیں ہے۔

اجتہاد اور جدت پسندی: اجتہاد کے نام پر یہ کہنا کہ ہم جدت پسند ہو سکتے ہیں جو چاہیں بدل دیں، کسی طرح قابل قبول نہیں ہے۔ اجتہاد بلاشبہ اسلام اور اسلام کے قانون کا حصہ ہے لیکن اجتہاد کا ایک بڑا معلوم اور معروف اصول ہے کہ احکام میں اجتہاد نہیں ہوتا۔ جو متعین احکامات ہیں وہ ہمیشہ کے لیے ہیں۔ [اجتہاد کے معنی یہ ہیں کہ جہاں قرآن و سنت سے کسی مسئلہ کا واضح، مفصل اور متعین حل سامنے نہیں آتا وہاں پورے غور و فکر اور علمی کاوش کے ساتھ قرآن و سنت کی ہی روشنی میں مسئلہ کے حل کا راستہ نکالا جائے۔] چنانچہ جہاں اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اس کی اجازت دی ہے اور موقع دیا ہے کہ یہ راستہ اختیار کر سکتے ہیں، وہاں ہم وہ راستہ اختیار کریں اور ان حدود کے اندر اختیار کریں جو قرآن اور سنت نے متعین کی ہیں۔ جنابِ والا! میں آپ سے صاف کہنا چاہتا ہوں کہ اس معاملے میں قرآن کا اصول یہ ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ... وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۝... هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۝ (المائدہ ۵:۴۴، ۴۵، ۴۷)

اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں... اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں... وہی فاسق ہیں۔

قرآن نے صاف کہا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (سورۃ النساء ۴:۵۹)

اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے معاملات میں اطاعت کرو اللہ کی اور اللہ کے رسول ﷺ کی اور اپنے میں سے اولو الامر کی اور جب تمہارے درمیان کوئی تنازعہ ہو یعنی اختلاف ہو تو پلٹو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف۔

اطاعت امیر کی حقیقت: بلاشبہ اولو الامر کی اطاعت اور اولو الامر سے اختلاف یہ دونوں اسلام کے اصول ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں صرف اطاعت کے لیے اولو الامر کی بات ہو رہی ہے اور وہ بھی اس انداز میں کہ گویا کہ [صدر صاحب] مامور من اللہ ہیں۔ ہمارے سامنے یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ کسی خاص شخص کے لیے حکمرانی کا خدائی حق اسلام میں نہیں ہے، یہ پجاریوں کی بات ہے۔ لیکن یہاں بڑے شوق سے بار بار یہ بات کہی جا رہی ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ جیسے امیر نے حضرت خالد بن ولیدؓ جیسے جرنیل کو ہٹا دیا تھا اور انہوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ بلاشبہ یہ ایک عظیم تاریخی حقیقت ہے۔ لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ انہیں کیوں ہٹایا گیا تھا؟ بلاشبہ اس ضمن میں اسراف کی بات بھی آتی ہے لیکن جو اصل وجہ تھی، جس کا انہوں نے خود اظہار کیا ہے۔ وہ یہ تھی کہ ہر محاذ پر حضرت خالد بن ولیدؓ کے ذریعے سے کامیابیوں پر کامیابیاں حاصل ہو رہی تھیں اور لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ یہ کامیابیاں گویا کہ اس قیادت [حضرت خالد بن ولیدؓ] کی بناء پر ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ان

کو ہٹا کر یہ دکھا دیا کہ یہ کامیابیاں اسلام کی بناء پر ہیں، مسلمانوں کی فوج اور جہاد فی سبیل اللہ کی بناء پر ہیں، کسی ایک شخص کی بناء پر نہیں ہیں۔ (الفاروق-مولانا شبلی نعمانی)

جنابِ والا! بلاشبہ اطاعتِ امر اسلام کا ایک اصول ہے لیکن اطاعتِ امر کا یہ اصول آج نہیں آیا۔ یہ ہماری تاریخ اور ہمارے دین کا حصہ ہے اور اس بُرے بھلے حال میں بھی کیا میں یہ یاد دلانے کی جسارت کروں کہ اطاعتِ امر کا یہی حق، یہی اصول کیا ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو نہیں تھا؟ اس وقت کے امیر نے اس وقت کے چیف آف سٹاف کو ایک حکم دیا۔ کیا اس موقع پر سپہ سالار نے وہی راستہ اختیار کیا جس راستے کی وہ آج تلقین کر رہا ہے۔ جنابِ والا! جو لوگ شیشے کے گھر میں رہتے ہیں ان کو ذرا احتیاط سے بات کرنی چاہیے۔

کرپشن کی صورتحال: جنابِ والا! اگلی چیز جس کا ذکر کیا گیا ہے وہ کرپشن ہے۔ کرپشن کے باب میں یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ آج ہمارا ملک جن موٹی موٹی وجوہ سے اپنے اصل مقام کو نہیں حاصل کر پا رہا، ان میں ایک کرپشن ہے اور یہ زندگی کے ہر شعبے میں ہے۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کی ایک تازہ ترین رپورٹ ہے جس کا خود میں نے نہیں بلکہ پاکستان میں ہمارے 'ملجا اور ماویٰ' ورلڈ بینک کے ڈپٹی ڈائریکٹر نے ابھی ایک سیمینار میں حوالہ دیا ہے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کی اس رپورٹ کی رو سے اس وقت پاکستان میں کرپشن کی سطح تعلیم، صحت، عدلیہ اور پولیس غرض ہر ادارے میں بڑھی ہے۔ یہ ہے رپورٹ۔ اس کے بعد آپ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے کرپشن کو ختم کر دیا ہے۔ بلاشبہ یہ خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔

معاشی ترقی کے دعوے: جنابِ والا! جس چیز کو آپ معاشی ترقی اور فلاح کہہ رہے ہیں، ماہر معاشیات کی حیثیت سے ان میں ہونے والی مثبت ڈیویلپمنٹ کا، میں نے ہمیشہ اعتراف کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ زرِ مبادلہ کے باب میں مالیاتی خسارے پر قابو کرنے کے سلسلے میں اور افراطِ زر کو قابو کرنے کے باب میں، اس دور میں ہمارا رویہ پچھلی حکومتوں کے مقابلے میں بہتر رہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بڑے اشاریے معیشت کی پوری تصویر پیش نہیں کرتے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں غربت، بیروزگاری، دولت کی غیر مساویانہ تقسیم میں اضافہ ہوا ہے۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ وہ صورتحال پیدا ہوئی ہے کہ جب فاقے سے لوگ مر رہے ہیں اور میں نہایت افسوس سے آپ سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ اس ملک میں ایسے واقعات بھی ہوئے ہیں کہ کراچی میں جہاں روپے کی ریل پیل ہے وہیں کالج کا ایک پروفیسر اور اس کی بیوی وقت پر پنشن نہ ملنے اور عزت کی وجہ سے گھر میں بیٹھے رہنے کے نتیجے کے طور پر اپنے گھر میں فاقے سے مر جاتے ہیں، کوئی ان کا پرسان حال نہیں ہے۔ آپ حضرت عمرؓ کی بات کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے تو یہ کہا تھا کہ دریائے فرات کے کنارے پر ایک جانور بھی بھوک سے مرے گا تو میں اس کے لیے جوابدہ ہوں گا۔ تو جنابِ والا! اس معاملے میں بھی آپ اس پوری تصویر کو سامنے رکھیں اور جو زمینی حقائق ہیں ان کو دیکھنے اور ان کا اعتراف کرنے کی ہمت کریں۔

دہشت گردی اور جوہری پھیلاؤ کے الزامات

جنابِ والا! صدر صاحب کی تقریر کا دوسرا حصہ الزامات کے بارے میں ہے اور یہ میرے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ حصہ ہے۔ میں بڑے دکھ سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ صدر صاحب اپنی مختلف تقاریر میں بار بار ان الزامات کو دہراتے رہے ہیں کہ افغانستان میں دہشت گردی کی جارہی ہے۔ کشمیر کی لائن آف کنٹرول پر ہونے والے واقعات کے لیے بھی لفظ دہشت گردی استعمال کیا گیا ہے۔ جوہری ہتھیاروں کے پھیلاؤ کا الزام اور انتہاپسندی اور پاکستان کا متعصب معاشرہ ہونا بھی ان کی تقاریر میں بار بار بیان کیا جاتا ہے۔

جنابِ والا! اس سے زیادہ تکلیف دہ اور شرمناک بات کوئی نہیں ہوسکتی کہ جو الزام ہم پر ہمارے دشمن لگا رہے ہیں، اور جو بحیثیت مجموعی جھوٹ اور مفاد پر مبنی ہیں اور ان دشمنوں کے عالمی عزائم کا حصہ ہیں، ہم ان کو خود قبول کر رہے ہیں بجائے اس کے کہ ہم دفاع کریں۔ جہاں کہیں کوئی خرابی ہے اس کی اصلاح ہمارا فرض ہے لیکن اس طرح الزامات کو اپنے اوپر اوڑھ لینا اور اس کے بعد پھر وہی زبان استعمال کرنا جو امریکی صدر بش اور اس کے حواری اور

ان کے ذرائع ابلاغ استعمال کر رہے ہیں، اس سے زیادہ تکلیف دہ بات اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ میر درد نے کہا تھا کہ ؎

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے
کس لیے آئے تھے ہم کیا کر چلے

تو جنابِ والا! میری نگاہ میں صدر صاحب کی تقریر کا یہ حصہ سب سے زیادہ افسوسناک ہے۔

پاکستان کی بقاء و سلامتی کا انحصار

جنابِ والا! اس تقریر کا تیسرا حصہ وہ ہے جسے میں ان کی تقریر کا نصیحتوں اور وعظ کا حصہ کہتا ہوں۔ اس میں انہوں نے عجیب و غریب باتیں کہی ہیں کہ پاکستان کی سلامتی کا انحصار دفاعی طاقت اور معاشی مضبوطی پر ہے۔ بلاشبہ دفاعی طاقت بہت ضروری ہے اور بلاشبہ معاشی مضبوطی بھی بہت ضروری ہے لیکن جنابِ والا! پاکستان کی بقاء اور سلامتی کا انحصار سب سے پہلے اس کے نظریئے، اس کے عقیدے، اس کی آزادی کے تحفظ اور ان اخلاقی قوتوں اور اقدار کی بنیاد پر ہے جن پر یہ ملک قائم ہوا ہے اور اس کو جتنا نظر انداز کیا جائے گا ہم اتنے کمزور سے کمزور تر ہوتے چلے جائیں گے۔

فوج اور سیاست: اس کے بعد جنابِ والا! سیاسی آزادی، جمہوریت اور سیاسی استحکام ضروری ہے۔ اور سیاسی استحکام کو انہوں نے نظر انداز کیا ہے۔ جہاں تک دفاعی طاقت کا تعلق ہے بلاشبہ دفاعی طاقت بہت ضروری ہے لیکن دفاعی طاقت کے لیے سب سے بڑا خطرہ، میں صاف کہنا چاہتا ہوں، فوج کی سیاست میں مداخلت ہے۔

جنابِ والا! یہ بات نوشتہ دیوار ہے کہ جس ملک میں فوج نے سیاست میں مداخلت کی ہے وہ ملک اپنے دفاع کے لائق نہیں رہا۔ کیونکہ اس صورت حال میں فوج اپنی پیشہ ورانہ صلاحیت کھو دیتی ہے اور ایک متنازعہ قوت بن جاتی ہے۔ وہ فوج پوری قوم کی امیدوں، توقعات اور دعاؤں کا مرکز اور محور نہیں رہتی۔ پاکستان میں ایوب خان صاحب کے زمانے

سے فوجی مداخلت کی جو پالیسی شروع ہوئی ہے اس کے نتیجے کے طور پر ہماری فوجی استعداد اور ہماری فوجی اور دفاعی قوت روز بروز کمزور ہوئی ہے۔ دفاعی قوت محض فوج کے مظاہرے کر دینے، بڑی بڑی بیرکیں بنا دینے اور یا جرنیلوں کی فوج ظفر موج بنا دینا نہیں ہے۔ آج حقیقت یہ ہے کہ ہمارے یہاں ۱۰۰ سے زیادہ جرنیل ہیں لیکن ان کی حربی اور پیشہ ورانہ صلاحیت کے بارے میں سوالات پیدا ہو رہے ہیں۔ سیاست میں الجھ کے انہوں نے فوج کے لیے بھی کرپشن کے دروازے کھول دیے ہیں۔ یہ اپنے دفاع کو کمزور کرنا ہے۔ اگر ہم فوج پر تنقید کرتے ہیں تو اس لیے نہیں کرتے ہیں کہ کسی حیثیت سے بھی ہم سمجھتے ہیں کہ فوج غیر اہم ہے۔ نہیں، فوج ہمارے دفاع کے لیے بے حد ضروری ہے لیکن ہم اس کو اس مقام پر دیکھنا چاہتے ہیں جہاں وہ دفاع کا کام سرانجام دے سکیں۔ سیاست میں مداخلت کر کے اور سیاست میں آلودہ ہو کر فوج کی پیشہ وارانہ صلاحیت کو تباہ کرنا ہماری سلامتی کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔

اچھی حکمرانی، وزیر اعظم کا نقطۂ نظر: جنابِ والا! میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اس ملک میں سلامتی کا انحصار عوام پر اعتماد ہے۔ عوام کی شراکت، عوام کی شمولیت اور پارلیمنٹ کی مؤثر کارکردگی جب تک نہیں ہوتی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ہم سلامتی اور استحکام حاصل نہیں کر سکتے ہیں۔ جنابِ والا! آپ کی اجازت چاہتا ہوں کہ اس اہم موقع پر صدر صاحب کے خطاب کے مقابلے میں، جو ۱۷ جنوری کو ہوا ہے، وزیر اعظم صاحب کے ۱۲ فروری کو نیشنل ڈیفنس کالج میں خطاب کا حوالہ دوں۔ یہ بڑا اہم خطاب تھا۔ میں ان کی حیثیت کا موازنہ نہیں کرنا چاہتا لیکن میری نگاہ میں وزیر اعظم کا وہ خطاب صدر صاحب کے خطاب کا بڑا مؤثر جواب ہے اور ہم سب کو اس پر غور و فکر کی نہایت ضرورت ہے۔ انہوں نے یہ کہا ہے کہ:

> ہمیں حکمرانی کے بحران کا سامنا ہے۔ اگر اس پر توجہ نہ دی گئی تو یہ جمہوری ترقی کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔

اور پھر اس کے بعد یہ قیمتی بات کہی ہے، جو میری نگاہ میں پارلیمنٹ کے لیے ضروری ہے کہ اس کا نوٹس لے اور اس پر کچھ کر کے دکھائے:

"تین عناصر جو کہ اچھی حکمرانی کا نچوڑ ہیں، انصاف، تحفظ اور ہر شعبے میں شہریوں کے مساوی مواقع کی فراہمی پر مشتمل ہیں"۔

چار سال کی فوجی حکومت کے بعد وزیر اعظم صاحب نے جو کہا ہے وہ سن لیجیے:

"انہوں نے کہا کہ بد قسمتی سے، پاکستان ان تمام معاملات پر اپنے عوام کے لیے بے حد غیر متعلق ہو رہا ہے۔ پولیس، آبپاشی، عدلیہ، محکمہ ریونیو کے شعبوں میں کمزور ادارہ جاتی کنٹرول نے خاص طور پر گاؤں میں عام آدمی کی زندگی انتہائی اذیت ناک کر دی ہے۔ پولیس اور عدلیہ کی طرح ریاستی اداروں پر عوام کے اعتماد کے فقدان نے ان کے جواز کو کھو دیا ہے اور اس نے ملک میں عوام کی سلامتی اور امن و امان کی صورتحال کو خراب کرنے میں براہ راست کردار ادا کیا ہے"۔

میرے خیال میں، انسانی حکمرانی کو تین مربوط جہات، اچھی سیاسی، معاشی اور شہری حکومت کے مطابق تصور کیا گیا ہے۔ یہ کہنا کافی ہے کہ جب تک لوگ حکومت کے نظام میں مکمل طور پر حصہ نہیں لیں گے یہ نظام نہیں چل سکتا"۔

جنابِ والا! وزیر اعظم صاحب نے اس کے بعد کہا ہے:

"میں علاقائی / قومی ارتباط کی معاشیات کے سلسلے میں ایک پہلو پر توجہ دینا چاہتا ہوں۔ ہم صوبوں میں ان کی ترقیاتی ضروریات کے بجائے آبادی کی بنیاد پر وسائل کی تقسیم کے قدیم نظام پر عمل پیرا ہیں"۔

عدلیہ کے بارے میں وہ کہتے ہیں:

"ملک بھر میں عدالتی نظام کی بنیادی خرابی یہ ہے کہ بنیادی طور پر غربت کی وجہ سے آبادی کے بڑے حصوں کے لیے انصاف تک رسائی نہیں ہے۔ انصاف کی فراہمی میں طویل تاخیر سے متعلق شکایات بھی ہیں"۔

تو جنابِ والا! میں آپ سے ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ صدر صاحب تو کوئی ایجنڈا نہ دے سکے لیکن اس پورے زمانے کے بارے میں وزیر اعظم نے ان کی تقریر کے ۷۲ دن بعد حالات کا جو جائزہ پیش کیا ہے وہ ایک آئینہ ہے جس میں تصویر کو دیکھا جا سکتا ہے۔

ہمارا ایجنڈا کیا ہونا چاہیے؟

جنابِ والا! صدر کی تقریر کے ان پہلوؤں کو لینے کے بعد اب میں چاہتا ہوں کہ آپ کے سامنے چند گزارشات پیش کروں کہ اس وقت فی الحقیقت ہمارا اصل ایجنڈا کیا ہونا چاہیے اور پارلیمنٹ کی ذمہ داری ان حالات کے اندر کیا ہے۔

دستور کی بحالی: جناب چیئرمین! میری نگاہ میں قوم کے سامنے سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ اداروں کی بحالی، اداروں کا تحفظ اور اداروں کی ترقی کس طرح ممکن ہو۔ اس ضمن میں پہلا اور اہم ترین ادارہ دستور ساز ادارہ ہے۔

جنابِ والا! دستور کے بارے میں، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ۱۷ویں ترمیم بحالی کے اس عمل کا نقطۂ آغاز ہے۔ ۱۷ویں ترمیم کا ایک حصہ یہ تھا کہ پارلیمانی کمیٹی دستور کے باقی تمام معاملات اور پچھلے چار سال میں جو بھی تبدیلیاں کی گئی ہیں ان تمام کا جائزہ لے کر اس کو حقیقی جمہوریت کی روح سے ہم آہنگ کرنے کے لیے سفارشات لائے گی۔ اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اس بات کو اولیت دیں کہ دستور اس سال کے اندر اندر اپنی صحیح روح اور اصولوں کے مطابق بحال ہو جائے۔

پارلیمنٹ کا کردار: جنابِ والا! دوسری بات ہے پارلیمنٹ کا کردار۔ اس سلسلے میں، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ ضروری ہے کہ تمام پارٹیوں کے مشورے سے سینیٹ اور نیشنل اسمبلی دونوں کا پورے سال کا پروگرام فوری طور پر طے کیا جائے اور اس پروگرام کے مطابق پورے سال کا نقشہ بنایا جائے۔ اس کے لیے قانون سازی کا پروگرام مرتب کیا جائے۔ اس کے لیے جتنے بھی اہم پالیسی معاملات ہیں ان پر بحث کا اہتمام کیا جائے۔ کمیٹیاں بحال کی جائیں اور ملک کو

آرڈیننسوں کی لعنت سے نجات دلائی جائے۔ میں پاکستان کی تاریخ کے چھپن سال کا مطالعہ کرنے کے بعد پوری دردمندی سے حکومت اور پارلیمنٹ ہر ایک سے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ اس ملک میں ۸۰ فیصد قانون سازی آرڈیننس کے ذریعے سے ہوئی ہے۔ اس سے زیادہ شرمناک بات اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ خدا کے لیے دستور کے آرٹیکل ۸۹ میں ترمیم کر دیجیے اور طے کر دیجیے کہ کوئی قانون سازی آرڈیننس کے ذریعے سے نہیں ہونی چاہیے۔ جو بھی ہو پارلیمنٹ کے ذریعے سے ہو، تب ہی ملک میں حالات بدل سکیں گے۔

فوج کا کردار: جنابِ والا! تیسری چیز ہے فوج کا کردار۔ بلاشبہ ہم نے بڑے بوجھل دل کے ساتھ ۳۱ دسمبر (۲۰۰۴ء) تک پرویز مشرف کے صدر اور چیف آف آرمی اسٹاف کے عہدوں پر بیک وقت فائز رہنے کی بات مانی لیکن اب جتنی جلدی ہوسکے چیف آف آرمی سٹاف کا عہدہ صدارت سے الگ کیا جائے، کل وقتی چیف آف آرمی اسٹاف مقرر کیا جائے اور فوج کو دفاع کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ میں اس خطرناک صورتحال سے آپ کو خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ آہستہ آہستہ فوج کا دخل سول انتظامیہ میں بلکہ معیشت میں، صنعت میں، زراعت میں اور اب تو خود پارلیمنٹ کے لوگوں کی تربیت میں بڑھتا جارہا ہے۔ آخر نیشنل ڈیفنس کالج کا کیا کام ہے کہ وہ پارلیمنٹ کے ممبران کے لیے ٹریننگ پروگرام بنائے۔ جنابِ والا! یہ کام پارلیمنٹ کا ہے۔

پارلیمنٹ کی خودمختاری کا تقاضا ہے اور دنیا کے سارے ممالک میں یہ کام پارلیمنٹ خود کرتی ہے۔ یہ کام آپ کو کرنا چاہیے۔ یہ کام نیشنل ڈیفنس کالج کو دینے کے معنی یہ ہیں کہ آپ خود پارلیمنٹ کے مستقبل کے کردار کے اندر فوج کو لا رہے ہیں۔ اس لیے میں کہنا چاہتا ہوں کہ فوج کے کردار کے معاملے کو ایک بار ہمیشہ کے لیے واضح ہونا چاہیے اور آرٹیکل ۶ کو مؤثر ہونا چاہیے۔ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ نیشنل سیکورٹی کونسل کی نہ کوئی ضرورت تھی اور نہ ہے۔ لوگوں کا یہ کہنا کہ اس طرح مارشل لاء ختم ہوجائے گا غلط ہے۔ اس طرح آپ دراصل فوج کا اور مارشل لاء کا سایہ دائمی طور پر ملک کی سیاست کے اوپر اور ملک کی جمہوریت کے اوپر قائم کر دیں گے۔ خدا کے لیے اس جال میں نہ پڑیں۔ جو پارلیمانی ادارے ہیں ان میں دفاعی

کمیٹی موجود ہے۔ اسی طرح نیشنل سیکورٹی کے لیے ہمارے پاس وافر انتظامات ہیں، انہیں متحرک کیجیے۔ ہمیں فوج کے اضافی کردار کے لیے کسی اور ادارے کی ضرورت نہیں ہے۔

عدلیہ اور وفاق کے مسائل: جنابِ والا! چوتھا ادارہ عدلیہ کا ہے۔ عدلیہ کی عزت کی بحالی، عدلیہ کی آزادی اور عدلیہ کا انتظامیہ سے جدا ہونا ہمارا ایجنڈا ہونا چاہیے۔ آپ پاکستان کی تاریخ میں دیکھیں پہلی مرتبہ عدلیہ اور بار کونسل کے درمیان ایک بڑا اخلاء پیدا ہوا ہے۔ پہلی مرتبہ پاکستان کی بار کونسل نے عدلیہ کے خلاف قرطاس ابیض شائع کیا۔ یہ ایک خطرناک صورتحال ہے۔ اس سے ادارے تباہ ہوں گے۔ خدا کے لیے اس کا بھی حل تلاش کیجیے۔

پھر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وفاقیت کی حفاظت کی جائے۔ اس وقت آپ ایک وحدانی نظام کی طرف آگئے ہیں اور فوج کی مداخلت جب بھی ہوگی ملک وفاقی سے ہٹ کر وحدانی نظام کی طرف آئے گا۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ ۱۹۷۳ء کے دستور کو ٹھیک ٹھیک نافذ کیا جائے اور بلا تاخیر نافذ کیا جائے۔ صوبوں کی چودہ دوسری وزارتیں ہیں، جن کو مرکز نے اپنے ہاتھوں میں لیا ہوا ہے۔ انھیں صوبوں کو منتقل کیا جائے۔ مشترکہ فہرست پر نظر ثانی کی جائے اور صوبوں کو وہ اختیارات دیئے جائیں، جو ان کا دستوری اور سیاسی حق ہے۔ اس کے بغیر آپ ملک میں مسائل پیدا کریں گے، اختلافات پیدا کریں گے اور خطرناک راہوں پر لے جائیں گے۔

مقامی حکومتوں کے بارے میں، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جس طرح یہ نظام آیا ہے وہ ایک وحدانی نظام کے حصے کے طور پر آیا ہے اور صدر کا حلقۂ انتخاب بنتا جارہا ہے۔ خدا کے لیے اس کو تاہ نظری سے نکلیے اور کوشش کیجیے کہ مقامی حکومت صحیح معنوں میں مقامی حکومت ہو۔ تیسرے درجے کے طور پر نہ ہو، صوبوں کے ساتھ ہو۔ وہ ہونی چاہیے اور ضرور ہونی چاہیے لیکن اسے اپنے طریقے پر ہونا چاہیے۔ اسے ایوانِ صدر کے دم چھلے کے طور پر نہیں ہونا چاہیے۔

قومی یکجہتی اور مصالحت: اگلی بات، جنابِ والا! آج قومی یکجہتی کی ضرورت ہے۔ ٹھیک ہے

میں اپوزیشن میں ہوں اور مجھے فخر ہے کہ میں اپوزیشن میں ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو قومی مسائل ہیں، ان پر قومی اتفاق رائے ہونا چاہیے۔ آج قومی مصالحت کی ضرورت ہے۔ جو لوگ باہر چلے گئے ہیں، چاہے وہ اپنی مرضی سے گئے ہوں یا ان کو بھیجا گیا ہو، انھیں قومی مصالحت کا حصہ ہونا چاہیے۔ ٹھیک ہے ان کے جو بھی کارنامے رہے، اچھے اور برے، ہمارے سامنے ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود ملک کے جو سیاسی و زمینی حقائق ہیں ان کو تسلیم کر کے ہی ہم آگے بڑھ سکتے ہیں۔ ماضی کی غلطیوں کا اعتراف اور ازالہ اور اس کے لیے سب کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔ قومی یک جہتی اور مصالحت کی ضرورت میری نگاہ میں اس سال کا اہم ایجنڈا ہے اور اس کے لیے کثیر جماعتی پالیسیوں کی تشکیل کرنا بہت ضروری ہے۔ اس کے ساتھ جہاں ہمارے درمیان اختلاف ہو وہاں ہمیں اختلاف کا احترام کرنا چاہیے۔

خارجہ پالیسی کا جائزہ: چھٹی بات جنابِ والا! اس وقت خارجہ پالیسی کا جائزہ اور جانچ پڑتال بہت بڑی ضرورت ہے۔ اس وقت ہماری خارجہ پالیسی لنگڑی چال چل رہی ہے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس کا کردار بھی تھوڑا سا پسماندہ ہے۔ امریکہ کی طرف جھکاؤ اور امریکہ کا ہمارے معاملات میں جو عمل دخل ہے اس سے ہماری آزادی، حاکمیت اور خود مختاری خطرے میں ہے۔ اس لیے ٹھنڈے دل سے سوچیے۔ ہمیں کسی سے لڑنا نہیں ہے۔ ہم امریکہ کی دوستی چاہتے ہیں جو ایک سپر پاور ہے۔ لیکن ہماری اپنی آزادی، نظریات، اقدار، معیشت اور ثقافت یہ اصل اہمیت رکھتے ہیں۔

معاشی پالیسی: ساتویں چیز، جنابِ والا! معاشی پالیسی کا جائزہ ہے۔ اس کے جو مثبت پہلو ہیں، ان پر قائم رہیے لیکن اس میں جو بڑے بڑے خلاء اور تضادات ہیں، جو خامیاں ہیں، جو نظر انداز شدہ پہلو ہیں، ان کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے۔ اس میں سب سے اہم چیز خود انحصاری ہے۔ غربت کو دور کرنا، روزگار کی فراہمی، تقسیمِ دولت کے معاملات کو بہتر کرنا، عوام کی شرکت اور معاشی ترقی کے ثمرات کو ایک محدود طبقے تک محدود نہ رہنے دینا بلکہ پوری معیشت کو تمام عوام تک پہنچانے کا انتظام کرنا ہے۔

احتساب: آٹھویں چیز، جنابِ والا! احتساب ہے۔ موجودہ احتساب بیورو اپنا قانونی جواز اور اعتبار کھو چکا ہے لیکن احتساب ضروری ہے۔ اسے سب کے لیے ہونا چاہیے۔ اسے شفاف ہونا چاہیے۔ پچھلے اجلاس میں ایک سوال کے جواب میں سینیٹ میں آنے والی چیزیں آپ کو یاد ہوں گی۔ وہ افراد جو وزارتوں میں بیٹھے ہوئے ہیں، ان کے نام اور کہاں کہاں ان پر مقدمات چل رہے ہیں، ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں کن کن کا نام ہے یہ ساری چیزیں آئیں لیکن ان کا کیا نوٹس لیا گیا۔ درحقیقت ہم نے احتساب کے عمل کو ایک مذاق بنا دیا ہے۔ احتساب کو حکومت اور اپوزیشن سے بالا ہونا چاہیے اور اس کے لیے ایک مکمل آزاد نظام بنانا از حد ضروری ہے، تب ہی قوم میں اس کے بارے میں اعتماد پیدا ہو سکے گا۔

تعلیم اور صحت: نویں چیز جنابِ والا! تعلیمی پالیسی ہے۔ اس وقت ہماری تعلیمی پالیسی بھی lopsided ہے جس سے تعلیمی معیار گر رہا ہے۔ میں ایک استاد ہوں، میں نے ۴۵ سال پڑھایا ہے۔ جب میں انٹرویو لینے کے لیے جاتا ہوں تو مجھے دکھ ہوتا ہے کہ مختلف مضامین میں درجہ اول میں ایم اے کر کے آنے والوں کو اپنے مضمون کی ابجد کا پتا نہیں ہے۔ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ دنیا کی وہ یونیورسٹیاں جو اس سے پہلے پاکستان کے صرف سرٹیفکیٹ پر داخلہ دے دیتی تھیں، آج وہ انکار کر دیتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں آؤ اور دوبارہ امتحان دو۔ تو خدا کے لیے اس کی فکر کیجیے۔

تعلیم کا نظریاتی پہلو اور بھی زیادہ اہم ہے۔ وزیر اعظم صاحب نے اپنی پہلی تقریر میں کہا تھا کہ اب قومی پالیسی اور قومی نصاب بنائیں گے۔ آج آپ کے ہاں تین تین تعلیمی نظام چل رہے ہیں۔ نجی تعلیمی ادارے کیمبرج سسٹم کے تحت اے لیول اور او لیول پیدا کر رہے ہیں۔ سرکاری تعلیم جس کا کوئی حال ہی نہیں ہے اور دینی تعلیم جو لوگوں کو دوسرے رخ پر لے جا رہی ہے۔ پھر ان میں سے ہر نظام میں اپنی اپنی جگہ کئی رنگ موجود ہیں۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم ایک قومی پالیسی بنائیں قومی مقاصد ہوں، قومی نصاب ہو۔ یہ سارے وہ معاملات ہیں جو پارلیمنٹ کے کرنے کے ہیں۔ بلاشبہ نظریاتی، اخلاقی، تہذیبی تعلیم بھی ضروری ہے اور اس کے ساتھ ساتھ فنی اور ٹیکنالوجی تعلیم بھی ضروری ہے، تب ہی ہم

اپنی تعلیم کو معیاری تعلیم قرار دے سکتے ہیں۔

یہی حال صحت کا ہے۔ صحت کی پالیسی میں پر ہیز(preventive) اور علاج (curative)دونوں چیزوں کو ساتھ لے کر چلنے کی ضرورت ہے۔عام آدمی کا حال یہ ہے کہ دوائی اس کو ملتی نہیں ہے۔ ہسپتالوں کا برا حال ہے۔ آج اگر ہم انسانوں کی بنیادی ضروریات پوری نہیں کریں گے تو پھر انتہا پسندی پیدا ہو گی، پھر تصادم پیدا ہو گا، پھر تشدد پیدا ہو گا۔ تشدد اور تصادم کو روکنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ آپ ضروریات زندگی کے حوالہ سے انصاف فراہم کریں۔ آپ عام آدمی کو آگے بڑھنے کے مواقع دیں۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ قوم بڑی زرخیز اور صلاحیتوں کی مالک ہے۔

ایٹمی صلاحیت کو لاحق خطرات

جنابِ والا! دو معاملات اور ہیں جن پر کہ ہمیں یکسو ہونا چاہیے۔ ان میں سے پہلا ہے ہماری جوہری صلاحیت۔ میری نگاہ میں اس وقت امریکہ کی تمام پالیسیوں کا اصل ہدف پاکستان کی نیوکلیئر صلاحیت کو تباہ کر دینا ہے۔ وہ اسے رول بیک کرنا اور اس پر اپنا قبضہ چاہتے ہیں۔ ان کو اسرائیل کی نیوکلیئر صلاحیت سے خطرہ نہیں ہے، انڈیا سے نہیں ہے، صرف پاکستان سے ہے۔ اور ہم اپنی نادانی میں اس کھانچے کے اندر گرفتار ہوتے چلے جا رہے ہیں جس میں امریکہ ہم کو لے کر جا رہا ہے۔ ہم نے غلط اعترافات کیے ہیں۔ ہم نے اپنا صحیح صحیح دفاع نہیں کیا ہے اور جو کچھ ہم نے کر لیا ہے میری نگاہ میں اس کے نتیجے کے طور پر ہم اگر مکمل نہیں تو ایک بڑا حصہ رول بیک کر چکے ہیں۔ اگر اب بھی ہم نے حالات کو نہ روکا تو مجھے ڈر ہے کہ ہم اس مقام پر پہنچ جائیں گے جہاں ہم ہندوستان کا مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں گے۔ جوہری دفاعی صلاحیت ایک متحرک اور ایک حرکی تصور ہے۔ اس کے لیے تحقیق بھی ضروری ہے اور نئے وسائل اور نئی ٹیکنالوجی کا حصول بھی ضروری ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی کوئی آپ کو خود نہیں دے گا۔ آپ کو اسے حاصل کرنا ہو گا یا پیدا کرنا ہو گا۔ جنابِ والا! میری نگاہ میں جوہری پروگرام کو بڑا خطرہ درپیش ہے اور ہر روز ہمارے قدم اس

معاملے میں پیچھے جارہے ہیں آگے نہیں جارہے ہیں۔ ہم سب کو مل کر ایک قومی پالیسی کے طور پر اسے اختیار کرنا چاہیے۔

کشمیر اور بھارت سے تعلقات

آخری اور گیارہویں چیز جنابِ والا! کشمیر اور کشمیر پالیسی اور اس سیاق و سباق میں بھارت سے تعلقات ہیں۔ یہ پارلیمنٹ کا حق ہے کہ وہ یہاں ان تمام چیزوں کے اوپر بحث کرے۔ کشمیر کے معاملے میں ہم نے ایک کے بعد دوسری پسپائی اختیار کی ہے۔ ہم نے بڑے دھڑلے سے پہلے یہ بات کی تھی کہ افغانستان میں ہم امریکہ کا ساتھ اس لیے دے رہے ہیں کہ وہاں پر افغانوں کے خلاف اقدام مختصر اور مخصوص ہدف پر ہوں گے۔ ہم نے کہا تھا کہ ہماری سرزمین افغانوں کے خلاف کسی آپریشن کے لیے استعمال نہیں ہوگی۔ ہم نے کہا تھا کہ شمالی اتحاد کو اقتدار نہیں سونپا جائے گا۔ ہم نے کہا تھا کہ ہم سے وعدہ کیا گیا ہے کہ وہاں جو بھی نظام بنے گا اس میں ہمارا مشورہ شریک ہوگا۔ ہم نے کہا تھا کہ ہم نے ایسا اس لیے کیا ہے کہ ہماری کشمیر پالیسی مستحکم ہو جائے گی اور ہم نے اس کے دفاع کے لیے یہ کام کیا ہے اور ہم نے اس لیے کیا ہے کہ ہمارے جوہری اثاثے محفوظ ہو سکیں گے[1]۔ ان باتوں میں سے ایک بھی بات پوری نہیں کی گئی۔

کشمیر کے معاملے میں ہم نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ کشمیر کی جدوجہد قومی مزاحمت اور جہاد آزادی ہے۔ فرانس کا انقلاب جس اصول پر ہوا اس کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ:

> ''جنگی کارروائیوں سے مزاحمت کا حق، اقوام متحدہ کے چارٹر کے مطابق حق خود ارادیت، انسانی حقوق کے بین الاقوامی اعلان کے مطابق حق خود ارادیت،

---

[1] ۹/۱۱ کے فوری بعد ۱۹ ستمبر ۲۰۰۱ء کو جنرل پرویز مشرف نے قوم سے خطاب میں امریکی جنگ کی حمایت کے فیصلہ پر گفتگو کرتے ہوئے جن چار نکات کی نشاندہی کی ان میں ایٹمی صلاحیت کی حفاظت اور کشمیر پر پیش رفت کے عنوانات شامل تھے۔ دیگر دو عنوانات ملکی سلامتی کا تحفظ اور قومی عزت و وقار تھے۔

غیر جانبدار تحریک کے چارٹر کے مطابق حق خود ارادیت"۔

آج چونکہ امریکہ ہر چیز کو دہشت گردی کہہ رہا ہے، ہم بھی اِدھر سے وہی کہہ رہے ہیں۔ ہندوستان کہہ رہا ہے "سرحد پار سے دہشت گردی، سرحد پار سے مداخلت" ہم بھی ان ہی اصطلاحات میں بات کر رہے ہیں۔ ہم نے کب لائن آف کنٹرول کو مانا ہے۔ ہمارے نزدیک وہ بین الاقوامی سرحد نہیں۔ کشمیری ایک ہیں۔ کشمیریوں کو بانٹ دیا گیا ہے لیکن ہمارا عالم یہ ہے کہ ہم آج خود جہاد، حق آزادی اور جہاد آزادی سب سے پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اقوام متحدہ کی قرار دادیں جو آئینی، قانونی اور سیاسی بنیاد ہیں، پورے معاملے کا اس پر بھی ہم سمجھوتہ کرنے کو تیار ہیں۔

ہماری پہلے پالیسی یہ تھی کہ تمام معاملات ہندوستان سے اسی وقت طے ہوں گے جب کشمیر کا بنیادی مسئلہ طے ہو جائے گا۔ اس سے آگے بڑھ کر ہم وہاں تک آئے کہ چلو اچھا ایک جامع اور مربوط حل ہو۔ مخلوط مذاکرات تو ہندوستان کی اصطلاح تھی، ہم نے تو اپنی اصطلاح بھی چھوڑ دی۔ ہماری اصطلاح تھی جامع اور مربوط مذاکرات۔ ہندوستان کی اصطلاح تھی مخلوط مذاکرات۔ تو ہم اس پر آگئے اور نتیجہ یہ ہے کہ اب جو بھی انڈیا کہہ رہا ہے وہ ہم کر رہے ہیں۔ رعایتیں ہم دے رہے ہیں لیکن حاصل کچھ نہیں کر رہے۔ ہم نے جنگ بندی کر دی ہے اور وہ سرحدیں بڑھا رہا ہے۔ وہاں پر ظلم ہو رہا ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں ہے کہ دس افراد کو شہید نہ کیا جا رہا ہو، مکانوں کو تباہ نہ کیا جا رہا ہو ٹارگٹ کلنگ نہ ہو۔ حتّٰی کہ عالم یہ ہے کشمیر میں جو آپ کے ہمنوا ہیں آج وہ باملا کہہ رہے ہیں کہ ہمیں جو توقعات پاکستان سے تھیں وہ پوری نہیں ہو رہی ہیں۔ سید علی گیلانی نے باچشم تر یہ کہا ہے کہ آج جو خون یہاں بہہ رہا ہے مجھے دکھ ہے کہ پاکستان اب اس خون پر احتجاج بھی نہیں کر رہا۔

حاصلِ کلام

جنابِ والا! یہ ہے وہ صورتحال۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا اصل ایجنڈا یہ دس نکات ہیں

جو میں نے آپ کے سامنے رکھے ہیں؛ انتظامیہ، پارلیمنٹ، عدلیہ، احتساب، مقامی حکومتوں کی اصلاح، تعلیمی پالیسی، معاشی پالیسی، خارجہ پالیسی اور پھر سب سے بڑھ کر جوہری دفاعی صلاحیت اور کشمیر کے بارے میں مکمل قومی یکجہتی کے ساتھ ایک قومی پالیسی پر ڈٹ جانا۔ دنیا میں وہی قومیں زندہ رہی ہیں جنہوں نے مزاحمت کی، جنہوں نے اپنے نظریات، اپنے مفادات اور اپنے اصولوں کی خاطر جان کی بازی لگائی۔ وہ جو پسپائی اختیار کرتے ہیں وہ کبھی زندہ نہیں رہتے۔ وہ اگر زندہ بھی رہتے ہیں تو مردوں سے بری حالت میں رہتے ہیں۔ تو زندگی کا قاعدہ یہی ہے، اصول یہ ہے کہ جو زندہ رہنا چاہتا ہے وہ مرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ جو مرنے کے لیے تیار نہیں ہے وہ عزت کی زندگی نہیں گزارتا۔ بدقسمتی سے ہم نے گذشتہ سالوں میں یہی راستہ اختیار کیا ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ ۱۹۴۰ میں جب ہم نے نظریۂ پاکستان اور تحریکِ پاکستان کا آغاز کیا تھا، ہماری کیا طاقت تھی؟ ۱۹۳۷ء کے الیکشن کے بعد مسلم لیگ کے کتنے افراد تھے مرکزی اسمبلی میں اور صوبائی اسمبلیوں میں؟ لیکن ہم نے ایک مقصد سامنے رکھ کر، ایک عزم اور ایک ہمت کے ساتھ جدوجہد کی اور سات سال میں اپنا مقصد حاصل کیا۔ مساوی طاقت ضروری نہیں ہوتی لیکن وژن اور نقشہ راہ ضروری ہے۔ ہمت اور قربانی کا جذبہ ضروری ہے۔ اور صرف یہی وہ راستہ ہے جس پر قوموں نے تاریخ کو بدل دیا ہے۔ رہا یہ معاملہ کہ آج کوئی سپر پاور ہے، غالب اور Dominant ہے اس لیے اس کی بات مان لی جائے تو جان لیجیے کہ تاریخ بڑی بڑی سپر پاورز کا قبرستان ہے۔

جنابِ والا! سوویت یونین کی کیا صورت تھی؟ روسی وزیر اعظم خروشچیف نے جنرل اسمبلی میں جا کر اپنے پاؤں میز کے اوپر رکھے تھے اور کہا تھا۔ میں سرمایہ داری کو دفنانے یہاں آیا ہوں۔ تو کہاں گیا وہ سوویت یونین؟ صرف غالب ہونا کوئی بات نہیں۔ بڑی بڑی طاقتیں ہیں جو تباہ ہوئی ہیں۔ آج امریکہ کو افغانستان میں اور عراق میں معلوم ہو رہا ہے کہ یک طرفہ فیصلوں کے نتائج کیا ہوتے ہیں اور سپر پاور کی تحدیدات کیا ہیں؟ تو ایسا نہیں ہے کہ ہم بالکل کمزور ہیں۔

جنابِ والا ! ہمیں اپنے عزم ،اپنے ایمان، اپنے انتہائی اہم مفادات اور اپنی قوم کو ساتھ لے کر چلنا ہے۔ اگر قوم آپ کے ساتھ ہے تو آپ مضبوط ہیں۔ اگر بش آپ کے ساتھ ہے تو آپ مضبوط نہیں ہیں۔ بش کا ڈھول بجانے سے آپ کو کچھ حاصل نہیں ہو گا۔

جنابِ والا! اس مجموعی تناظر میں اپنی بات کو یہ کہہ کر ختم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ صدارتی خطاب نہایت مایوس کن اور حقیقی مسائل سے انحراف ہے اور اس میں اغماض کیا گیا ہے۔ محض نصیحتیں اور مکے دکھانے سے پارلیمانی نظام ،ملک کی سلامتی، ملک کی ترقی کا راستہ اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ ہمیں توقع تھی کہ جنرل صاحب اس دستوری نظام کی بحالی اور ۱۷ ویں ترمیم کے بعد کوئی سبق سیکھیں گے اور ایک مدبر کا کردار ادا کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن بدقسمتی سے انہوں نے مدبر کی بجائے ایک کمانڈو کا کردار اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ کمانڈو کا کردار میدانِ کارزار میں نہیں وہ پارلیمنٹ آکر اختیار کرتے ہیں اور سیاست میں کرتے ہیں۔ درحقیقت اس سے زیادہ شرمناک کوئی اور چیز نہیں ہوسکتی۔ (۲۰فروری ۲۰۰۴ء)

باب نمبر ۵

حکومتی وعدوں کے برعکس پرانی پالیسیوں کا تسلسل

[آصف علی زرداری کے خطاب پر تبصرہ (۲۰۰۸ء)]

جناب آصف علی زرداری نے صدرِ پاکستان منتخب ہونے کے دو ہفتے کے اندر پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے ۲۰ ستمبر ۲۰۰۸ء کو خطاب کیا۔ انھوں نے ملک سے غربت، بھوک، دہشت گردی اور انتشار و افتراق کے خاتمے کو اپنا خواب قرار دیا۔ بلوچستان کے عوام سے ہونے والی زیادتیوں پر حکومتِ پاکستان کی جانب سے معافی مانگی اور صوبے کے لیے رائلٹی اور جائز حقوق کی مد میں واجبات کی ادائیگی کا اعلان کیا۔ اس کے علاوہ قبائلی علاقوں میں اصلاحات، فرنٹیئر کرائم ریگولیشنز کے خاتمے اور ان کی مرکزی دھارے میں شمولیت ان کی تقریر کے اہم نکات تھے۔

جناب زرداری نے ۱۹۷۳ء کے آئین کی اصل صورت میں بحالی کے لیے کل جماعتی پارلیمانی کمیٹی کے قیام کا اعلان کیا۔ دہشت گردی اور انتہاپسندی سے نمٹنے کے لیے امن، ترقی اور ہتھیار نہ رکھنے والے دہشت گردوں کے خلاف آخری آپشن کے طور پر مسلح کارروائی کی سہ نکاتی حکمت عملی بیان کی اور پاکستان کے اس اعلانیہ مؤقف کو دہرایا کہ ہم پاکستان کی حدود سے کسی دوسرے ملک کے خلاف کوئی دہشت گردی کی کارروائی نہیں ہونے دیں گے اور نہ ہی اپنے وطن کی آزادی اور خود مختاری کے خلاف کسی کارروائی کو برداشت کریں گے۔ انھوں نے بھارت اور افغانستان کے ساتھ امن اور کشمیر سمیت تمام مسائل پر جامع مذاکرات کے مؤقف کو دہرایا۔ اس کے علاوہ غربت کے خاتمے، ٹریڈ یونین پر پابندی کے خاتمے کو اپنے ایجنڈے کو مرکزی نکتہ قرار دیا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں دفاعی بجٹ پر پارلیمنٹ میں بحث اور پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کی سربراہی حزبِ اختلاف کے حوالے کرنے کا اعلان بھی کیا۔

زیرِ نظر تحریر اس خطاب پر مشتمل ہے جو پروفیسر خورشید احمد نے اس صدارتی خطاب پر بحث کے دوران سینیٹ میں کیا۔

جناب چیئرمین! سب سے پہلے تو میں اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کروں گا کہ آصف علی زرداری صاحب نے اپنے انتخاب کے دو ہفتے کے اندر اندر پارلیمنٹ سے خطاب کیا ہے۔ یہ بڑی اچھی روایت ہے۔ ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ سابق فوجی صدر مشرف کے رویے کے مقابلے میں یہ صحیح، دستوری اور جمہوری رویہ ہے۔ مجھے توقع ہے کہ وہ آئندہ بھی ہر سال دستور کے مطابق اس کا اہتمام کریں گے۔ لیکن ایک پرانے رکن پارلیمنٹ کی حیثیت سے اس پارلیمانی روایت کی جانب متوجہ کرنا چاہوں گا کہ صدر کے خطاب کی جو دستوری پابندی ہے وہ صدر کے ذاتی خیالات یا پارٹی کے نقطۂ نظر کے بیان کے لیے نہیں، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ حکومت، جو ایک مخلوط حکومت ہے، اگلے سال کے لیے کیا قانون سازی اور کیا پالیسی اقدامات کرنا چاہتی ہے۔ پارلیمنٹ سے خطاب کا معنی ہی یہ ہے کہ سال بھر کا ایجنڈا پارلیمنٹ کے سامنے رکھا جائے۔ اسی لیے یہ تقریر صدر کرتا ہے لیکن دراصل یہ حکومت کا پالیسی بیان ہوتا ہے۔ اس وقت حقیقی صورت یہ ہے کہ دو چار باتیں انہوں نے اس ڈھانچے کے اندر کہی ہیں لیکن بیشتر باتیں ان کی ذاتی ہیں یا پارٹی کی ہیں۔ ان باتوں کی حیثیت ایک سال کے لیے مخلوط حکومت کی قانون سازی اور پالیسی اقدامات کے بیان کی نہیں ہے۔ میں متوجہ کروں گا کہ آئندہ اس بات کا خیال رکھا جائے۔

حکومتی وعدوں پر عملدرآمد کا جائزہ

دوسری بات، جنابِ والا! مجھے اس کا اعتراف ہے کہ اس حکومت نے اقتدار میں آنے کے بعد سیاسی صورت حال ہو یا امن و امان اور معاشی و بین الاقوامی دباؤ، ان سب کے اعتبار سے ایک مشکل صورت حال میں اپنے کام کا آغاز کیا ہے۔ درحقیقت اسی پس منظر میں اپوزیشن نے اختلاف کے باوجود اس بات کی کوشش کی ہے کہ وہ اپنی رائے کا اظہار ضرور کرے لیکن انہیں کام کرنے کا موقع دے اور وہ ہم دے رہے ہیں لیکن سات مہینے گزرنے کے بعد ہمارا اضطراب، ہماری تشویش اور ہماری مایوسی بڑھ رہی ہے۔

میں صرف ریکارڈ کی خاطر یہ کہوں گا کہ کم از کم آٹھ وعدے ایسے ہیں جو انہوں نے

حکومت میں آنے کے بعد بھی اور آنے سے پہلے بھی کیے تھے، لیکن سات مہینے گزرنے کے بعد بھی وہ پورے نہیں ہوئے۔ اس میں نمبر ایک، عدلیہ اور چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کی بحالی کا وعدہ تھا۔ لیکن ان کی بحالی کی بجائے نظامِ عدل سے وابستہ طبقات کو بانٹنے، عدلیہ کو بدنام کرنے اور اس کی عزت کو عوام کی نظروں میں مزید مشکوک بنانے کے لیے کام کیا گیا ہے۔ نمبر دو، تین نومبر (۲۰۰۷ء) کو ایمرجنسی اعلان جس کے بارے میں پی پی پی، مسلم لیگ (ن) اور تمام پارٹیاں بجز (ق) لیگ کے متفق تھیں کہ یہ غیر قانونی ہے اور اس کے تحت کیے جانے والے اقدام بھی غیر قانونی ہیں اس کے غیر قانونی ہونے کا اعلان ہونا چاہیے تھا اور اس طرح اس کی تلافی ہونی چاہیے تھی، یہ نہیں ہوا۔

نمبر تین، یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ ۱۹۷۳ء کے آئین کو، جیسا کہ وہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو تھا، بحال کیا جائے گا اور اس شکل میں لایا جائے گا جس میں کہ وہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو تھا۔ دوسرے الفاظ میں ۱۷ ویں آئینی ترمیم کی بناء پر دستور میں جو تراش خراش کی گئی ہے اس کو واپس کیا جائے گا۔ ہم نے خود اس بات کا اعتراف کیا کہ ۱۷ ویں ترمیم میں ہمارے ساتھ دھوکہ کیا گیا۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں اور تمام تبدیلیاں جو اس میں کی گئی ہیں ان کو درست کرنے کے لیے ہم آپ کا ساتھ دیں گے۔ اس سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ جو کمیٹی بنانے کا وعدہ ۲۰ ستمبر ۲۰۰۸ء کو کیا گیا تھا، پانچ ہفتے آج گزر گئے ہیں، جائزہ لینے کے لیے یہ کمیٹی بھی نہیں بنی۔

مجھے اجازت دیں کہ میں یہ بات کہوں کہ اس کے برعکس زرداری صاحب ان تمام اختیارات کو استعمال کر رہے ہیں اور صدارت کا وہ وژن اور ماڈل وہ پیش کر رہے ہیں جو ۱۹۷۳ء کے آئین والا نہیں بلکہ سابق فوجی صدر مشرف کے تبدیل شدہ دستور کا ہے۔ کابینہ کی میٹنگ کی صدارت کرنا اور ان کی جانب سے پالیسی فیصلوں کا مؤخر کیا جانا اسی کی علامات ہیں۔ پھر اس خطاب میں ایک جملہ ایسا ہے جو اگر زبان کا چوک جانا نہیں ہے تو وہ ان کے ذہن کی غمازی کرتا ہے۔ وہ بات یہ ہے ''میں حکومت کی مدد سے ملک کو اندھیرے سے نکالوں گا'' جیسے کہ حکومت ان کی ماتحت ہے یا ان کی خادم ہے حالانکہ یہ کام پارلیمنٹ کا ہے۔

وہ سربراہِ حکومت نہیں۔ انہیں وزیر اعظم کے مشورے پر عمل کرنا ہو گا۔ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں یہ صدارتی نظام کا ماڈل ہے یہ پارلیمنٹری نظام کا نہیں ہے۔ اپنے ذہن کو یکسو کیجیے۔ دستور کی جو اکھاڑ پچھاڑ ہوئی ہے اس کو درست کیجیے۔ اس کے بغیر ہمارے ملک میں جمہوریت کا فروغ اور دستور کو استحکام نہیں مل سکے گا۔

چوتھی بات آپ نے اطلاعات کی آزادی کے قانون کا وعدہ کیا، وہ مسودہ نہیں آیا۔ طلبہ یونین کی بحالی اور قانونی طریقے سے مزدور یونین کی بحالی کی بات کی۔ مجھے معلوم ہے کہ کچھ مقامات پر مزدور انجمنیں بنائی جارہی ہیں۔ یہ اچھا ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ باقاعدہ قانون سازی ہو۔ اس قانون سازی کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ کشمیر کے مسئلہ پر آپ ہی کے بیانات کا جو اثر وژن اور پالیسی پر پڑا ہے اس کی اصلاح ہو سکے گی، وہ نہیں ہوا ہے۔ آپ کے منشور میں میثاقِ جمہوریت شامل ہے اس میں آپ نے وعدہ کیا تھا کہ ہر سطح پر احتسابی عدل کا آزاد انتظام کیا جائے گا لیکن سیاستدانوں، بیوروکریسی اور دیگر کے احتساب کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ الیکشن کمیشن کی اصلاح ہو گی اور وہ آزاد ہو گا۔ لیکن اس کے لیے بھی آپ نے جو وعدے کیے تھے، سات مہینے گزرنے کے بعد یہ پورے نہیں ہوئے ہیں۔ جنابِ والا! مجھے اجازت دیجیے کہ مومن خان مومن کی زبان میں ایک شعر آپ کی خدمت میں پیش کروں ؎

سنو ذکر ہے کئی سال کا کہ کیا اک آپ نے وعدہ تھا
سو نبھانے کا تو ذکر کیا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ یہ تمام وعدے آپ نے پورے کرنے ہیں۔

پاکستان کی خود مختاری

جناب چیئرمین! حقیقت یہ ہے کہ موجودہ حکومت پرویز مشرف کی پالیسی کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ ابھی تک تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ پارلیمنٹ کی قرارداد میں تبدیلی کا واضح

اعلان کیا گیا ہے[1]۔ مجھے اتفاق ہے کہ اس قرار داد کو ابھی چند دن ہی ہوئے ہیں لیکن اس کے بعد فوری طور پر تبدیلی لانی ضروری ہے۔ میرا احساس ہے کہ تبدیلی نہیں لائی جارہی ہے تو اس کا باعث صرف امریکہ اور اس کا دباؤ ہے۔ میں صرف دو چیزیں آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ کل کے ہیرالڈ ٹریبیون میں شائع شدہ ایک مضمون میں بتایا گیا ہے کہ صرف اگست کے مہینے سے اب تک پاکستان میں ۱۹ ڈرون حملے ہوئے۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا کہ یہ حملے پاکستانی علاقوں میں صرف ان چھ میل کے اندر نہیں ہوئے جس کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ مشرف نے اجازت دے دی تھی۔ اس کی اطلاع یہ ہے کہ چالیس کلو میٹر یعنی ۲۶ میل کے فاصلے میں یہ حملے ہوئے ہیں۔ ان حملوں میں Hellfire missiles استعمال کیے گئے ہیں اور اس سے بیسیوں افراد جاں بحق ہوئے ہیں۔ لیکن اس مضمون میں سب سے زیادہ خطرناک بات یہ کہی گئی کہ:

> پاکستانی حکام نے واضح کیا ہے کہ وہ پریڈیٹرز کے حملوں کو پاکستان کی خود مختاری پر زیادہ قابلِ اعتراض نہیں سمجھتے۔

میں یہ چاہوں گا کہ اس کا فوری نوٹس لیا جائے اور اس ایوان کو اس بارے میں حقائق سے آگاہ کریں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ صحیح ہے۔ اگر یہ صحیح نہیں ہے، اور مجھے امید ہے کہ صحیح نہیں ہوگا، تو سرکاری طور پر اس بات کو کہنے کے بعد اس بات کی ضرورت ہے کہ اس امریکی دعوے کا کھلا کھلا توڑ کیا جائے۔ اس سے بھی زیادہ خطرناک بات جو اسی مضمون میں امریکہ کے ترجمان نے کہی ہے وہ یہ ہے کہ:

> پاکستان کی مکمل خود مختاری کا احترام کرنے کے مابین ہمیشہ توازن موجود ہے، اگر

---

[1] ۲۲ اکتوبر ۲۰۰۸ء کو پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں قومی سلامتی پالیسی سے متعلق ایک ۱۴ نکاتی قرار داد پاس کی گئی جس میں آزاد خارجہ پالیسی، دہشت گردی کے خلاف جنگ کے لائحہ عمل پر نظر ثانی، عسکریت پسندوں سے مذاکرات، پاکستان کی خود مختاری اور سالمیت کا تحفظ اور پاکستان کی سرزمین کو دوسروں کے خلاف استعمال نہیں ہونے دیا جائے گا جیسے اہم معاملات پر پارلیمنٹ نے اپنی واضح سوچ کا اظہار کیا۔

وہ اپنی خود مختاری کا تحفظ کرنے کے اہل نہ ہوں اور انہیں ہمارے تحفظ کی ضرورت ہو۔

یعنی گویا کہ اب خود مختاری بھی مضروب ہو رہی ہے، جہاں آپ کا دل چاہے آپ خود مختاری کی ناک مروڑ دیں۔ یہ بڑا خطرناک دعویٰ ہے لیکن اس سب سے زیادہ خطرناک چیز آج کے ''نیشن'' میں رپورٹ ہوئی ہے۔ اس رپورٹ میں امریکہ میں موجودہ حکومت کے تعینات کردہ پاکستانی سفیر حسین حقانی کا ارشاد گرامی بیان کیا گیا ہے۔ اخبار یہ کہتا ہے:

پاکستان کے سفیر برائے امریکہ جناب حسین حقانی نے اس ماہ امورِ خارجہ کی کونسل کو بتایا کہ دونوں ممالک مخصوص اہداف کے خلاف استعمال ہونے والے اسٹریٹجک آلات کی تعیناتی میں تعاون کر رہے ہیں۔

اگر آپ غور کریں یہ بڑا ہی خطرناک اضافہ ہے۔ اگر انہوں نے کہا ہے اور اگر ان کے الفاظ اخبار میں واوین میں دیئے گئے ہیں اور ایک سرکاری ادارے فارن مشنز کونسل کے سامنے انہوں نے یہ الفاظ کہے ہیں۔ اگر یہ باتیں درست ہیں تو پھر مجھے اجازت دیجیے کہ میں یہ بات کہوں کہ پارلیمنٹ کی قرارداد کا کوئی احترام حکومت نے نہیں کیا۔ قوم کے جذبات واحساسات کا کوئی احترام آپ نہیں کر رہے۔ جس طرح امریکہ کے بازو مروڑنے کی بنیاد پر مشرف صاحب امریکہ کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے اور اپنے ملک کے لوگوں کو مار رہے تھے وہی اقدامات آپ نے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ یہ نہایت خطرناک پالیسی ہے خدا کے لیے اس سے بچیے۔

ملک کی معاشی صورتحال

اگلی بات جنابِ والا! امن و امان کی صورتحال، توانائی اور خوراک کا بحران، مالیاتی بحران اور اقتصادی بدحالی سے متعلق ہے۔ ان تمام معاملات میں بڑی ہی خطرناک صورتحال ہے۔ میں ان باتوں کو دہراؤں گا نہیں جو میرے بھائی اسحاق ڈار صاحب نے بڑے مؤثر دلائل کے ساتھ گزشتہ روز بیان کی تھیں۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ معیشت جس حالت

میں ہے اور اس کے باوجود سات مہینے تک حکومت اس کی بحالی کے بارے میں قوم کے سامنے کوئی واضح پالیسی اور کوئی مؤثر متبادل حل نہیں لا سکی یہ بڑی ہی تشویشناک کیفیت ہے۔

جنابِ والا! مجھے اتنی بات کہنے کی اجازت دیجیے کہ موجودہ معاشی صورتِ حال جہاں مشرف صاحب اور ان کی معاشی ٹیم کی غلط کاریوں کا نتیجہ ہے وہیں موجودہ حکومت کی غیر یقینی پر مبنی نااہل پالیسیاں اس کی ذمہ دار ہیں۔ معاشی ٹیم کی اہلیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ کل ہمارے بھائی حاجی عدیل نے ایک بڑا پیارا جملہ کہا تھا کہ ایک بینکر آتا ہے اور ایک بینکر چلا جاتا ہے[1]۔ لیکن معیشت کی حالت یہ ہے کہ یہ عوام کے خلاف جا رہی ہے۔ یہ بڑا خطرناک رجحان ہے۔ جنابِ والا! ہم دوبارہ آئی ایم ایف کی طرف جا رہے ہیں۔ اس سے بڑا تباہ کن سانحہ کیا ہو گا۔ خدا کے لیے قوم کو اعتماد میں لیجیے اور آئی ایم ایف سے قوم کو بچائیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ صدر کی تقریر کا یہ پہلو بھی بہت ہی کمزور اور قابلِ گرفت ہے۔

انتہا پسندی سے نمٹنے کا طریقہ

اگلی بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کسی بھی دوسرے ملک کی طرح ہمارے ملک کے مستقبل کا تعلیم، صحت، انسانی وسائل کی ترقی، سائنس اور ٹیکنالوجی پر انحصار ہے، لیکن مجھے بہت تعجب ہوا کہ اس تقریر میں اس سلسلے میں حکومت کی پالیسی کا کوئی ذکر نہیں۔ جو چیلنجز ہیں ان کا ادراک اور ان کے خاتمہ کے بارے میں کوئی شعور موجود نہیں ہے۔ ایک جملہ میں آپ کو ضرور بتانا چاہتا ہوں جو صدر صاحب نے فرمایا ہے کہ جبر سے تصورات کو قتل نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے اس سے پورا پورا اتفاق ہے۔ میں ممنون ہوں کہ آپ نے بڑی زحمت کی ہمیں بتانے کی کہ "Ideas cannot be killed by oppression"۔ بالکل صحیح ہے لیکن ہو کیا رہا ہے کہ جس چیز کو آپ آج انتہا پسندی کہتے ہیں۔ وہ خیالات ہیں، وہ رویہ ہے، وہ پالیسی

---

[1] اشارہ ہے سابق وزیر اعظم شوکت عزیز کے حکومت سے رخصت ہو جانے اور پیپلز پارٹی کی اس وقت کی حکومت میں عبدالحفیظ شیخ کے وزیر خزانہ کے طور پر تقرری کی جانب۔ شوکت عزیز سٹی بینک کے سینئر ایگزیکٹو کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے تھے جبکہ عبدالحفیظ شیخ طویل عرصے ورلڈ بینک سے وابستہ رہے تھے۔

ہے اور اس کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ لیکن بمباری سے وہ اصلاح نہیں ہو سکتی ہے، وہ لوگوں کو مارنے اور نیست و نابود کرنے سے نہیں ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے جو راستہ ہے وہ بات چیت، تعلیم، گنجائش پیدا کرنے اور افہام و تفہیم میں ہے لیکن آپ وہ راستہ اختیار نہیں کر رہے ہیں۔ یہ بڑا خطرناک معاملہ ہے۔ خدا کے لیے قوم کو اس طرح خانہ جنگی کی طرف جانے سے بچایئے۔

فوج کا احترام میں بھی کرتا ہوں اور اسے ملک کی سلامتی کے لیے ضروری سمجھتا ہوں۔ اس کی عزت پر حرف آنا خطرناک ہے۔ لیکن اگر ملک کی فوج کو ملک کے عوام کے خلاف استعمال کیا جائے گا اور ہزاروں افراد اس میں جاں بحق ہوں گے، ہزاروں زخمی ہوں گے اور لاکھوں بے گھر ہوں گے، اربوں کا نقصان ہو گا تو کیا فی الحقیقت یہ عوام اور فوج کے درمیان محبت کے رشتے کو فروغ دینے کا ذریعہ ہے؟ اس سے تو نفرتیں ابھریں گی۔ خدا کے لیے اس طرزِ عمل کو تبدیل کیجیے۔ یہ پالیسی غلط ہے کہ فکر کا مقابلہ توپ سے یا ہیلی کاپٹروں کی بمباری سے ہو سکتا ہے۔ اس پالیسی کو آپ کو بدلنا پڑے گا۔

کرپشن کا عفریت

جنابِ والا! میرا اگلا موضوع کرپشن ہے۔ میں بڑے دکھی دل کے ساتھ اس موضوع پر بات کر رہا ہوں۔ میرا پارلیمنٹ کا ریکارڈ ۱۸ سال پر مبنی ہے اور ۵۰ سالہ میری سیاسی زندگی ہے۔ الحمدللہ میں نے کبھی کسی پر ذاتی الزام نہیں لگایا ہے۔ میں سمجھتا ہوں جب تک باقاعدہ عدالتی عمل کے ذریعے کسی پر جرم ثابت نہیں ہوتا، وہ معصوم ہے۔ الزام کسی بھی شخص کو مجرم نہیں بناتا ہے۔ ہاں! الزام کے بعد صحیح قانونی طریقہ اختیار ہونا چاہیے۔ اس طرح الزام باقاعدہ ثابت ہو تو جرم ہے۔ لیکن یہ کام نہیں ہو رہا۔ اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ آج ہی کی نہیں بلکہ ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کی ہر رپورٹ یہ بتا رہی ہے کہ کرپشن سیاست دانوں، افسر شاہی، فوج، عدلیہ اور پولیس میں ہر جگہ موجود ہے۔ ٹرانسپیرنسی کی تازہ ترین رپورٹیں کہتی ہیں کہ ملک کے جی ڈی پی کا ۱۰ سے ۱۵ فیصد کرپشن کی نذر ہو رہا ہے۔ یہ کرپشن ہماری سوسائٹی اور معیشت کو گھن کی طرح کھائے جا رہی ہے۔

دوسری جانب جس تشدد کے خلاف ہم جنگ کر رہے ہیں، اگر اس کی صحیح اقتصادی لاگت شمار کریں جس نے معیشت کو تباہ کرنے میں ایک بڑا کردار ادا کیا تو آپ کو یاد ہو گا کہ ۲۰۰۶ء میں امریکہ کی سینٹرل کمانڈ نے یہ کہا تھا کہ پاکستان کی معیشت کو ۱۰ سے ۱۲ بلین ڈالر کا نقصان ہوا ہے۔ تازہ ترین اعداد و شمار یہ بتاتے ہیں کہ ہماری معیشت کو ۳۵ سے ۴۰ بلین ڈالر کا نقصان ہوا ہے۔ جب تک آپ ان چیزوں کا سامنا نہیں کریں گے، آپ اس سے کیسے نکلیں گے۔ میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ NRO جس کے ذریعے بر سر اقتدار لوگوں نے اپنی بے گناہی ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے، وہ کوئی جملہ استثنیٰ نہیں کہ اس کے ذریعے آپ کو کوئی فائدہ نہیں ملا ہے۔ در حقیقت یہ آپ کے، ہمارے اور خود پارٹی کے مفاد میں ہے کہ جو باتیں کی جارہی ہیں، ان پر پردہ نہ ڈالا جائے بلکہ مناسب انداز میں ان کا سامنا کیا جائے۔ اور سامنا کرنے کے بعد اگر وہ عمل ان سب افراد کو جن پر یہ الزام ہے بے گناہ قرار دیتا ہے تب ان کی بے گناہی تسلیم کی جائے۔ اس سے نہ صرف ان تمام افراد کی عزت بحال ہو گی بلکہ مجموعی ماحول بھی بہتر ہو گا۔ لیکن اگر یہ پراسیس انہیں مجرم قرار دیتا ہے تو پھر انہیں قرار واقعی سزا ملنی چاہیے۔

بیرونی دنیا میں وطن کی تصویر

جنابِ والا! آپ ملک کے اخبارات ہی نہیں۔ بیرونی دنیا کے اخبارات دیکھ لیجیے، سچی بات یہ ہے کہ انہیں پڑھ کر میرا دل دکھتا اور خون کے آنسو روتا ہے۔ میں بڑی شرمندگی کے ساتھ آپ کی اجازت سے صرف دو اقتباسات سنانا چاہتا ہوں۔ یہ ۲۲ ستمبر (۲۰۰۸ء) کا Times Weekly ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ:

> ”زرداریوں نے پاکستان کے ایوانِ صدر کو سنڈریلا کی کہانی کی طرح سنسنی خیز مافیا میں بدل دیا ہے۔ سینما گھر کے مالک کے بیٹے زرداری نے ۱۹۸۷ء میں پاکستان کی سیاسی شہزادی بے نظیر بھٹو سے شادی کی، یہی وہ وقت تھا جب وہ سیاسی زندگی شروع کرنے والی تھیں“۔

> ”اگر پارلیمنٹ میں کسی کو شکایات ہوتی تو وہ زرداری کو بیچ میں ڈال دیتی۔ زرداری

پس پردہ معاملات کو نمٹاتا تھا، تعلقات استوار کرنے کا طریقہ جانتا تھا۔ زرداری کی ساکھ ہمیشہ ساز باز کے ساتھ معاملات کو آگے بڑھانے کی تھی۔ جب آصف علی زرداری بے نظیر بھٹو کے دوسرے دور میں وزیرِ ماحولیات تھے تو کک بیک اسکینڈلز میں ان کے مبینہ طور پر ملوث ہونے کے سبب انہیں مسٹر ۱۰ پرسنٹ کا لقب ملا"۔

"بے نظیر بھٹو کی مخالف نواز شریف اور مشرف کی حکومتیں زرداری کے خلاف برطانیہ، اسپین اور سوئٹزرلینڈ میں منی لانڈرنگ اور بدعنوانی کے مقدمات کی پیروی کرتی رہیں لیکن گذشتہ موسم خزاں میں مشرف کے ساتھ معافی نامہ کے ایک متنازعہ معاہدے کے بعد تمام الزامات خارج کر دیے گئے تھے۔ زرداری کا کہنا ہے کہ الزامات سیاسی تھے تاکہ ان کی ساکھ متاثر ہو"۔

"زرداری کو نہ صرف اپنے مشتبہ ماضی کو ڈھانپنا پڑا بلکہ انہیں شدید صدمے کے وقت اپنی شکستہ قوم کو متحد کرنا پڑا"

یہ ایک بہت مؤقر چیز ہے۔ میں نے کسی عام میگزین کو نہیں لیا ہے۔ دوسرے آپ The Economist لیجیے، یہ اپنی ۱۳ ستمبر کی اشاعت میں کہتا ہے:

"۹ ستمبر کو پاکستان کے صدر کی حیثیت سے آصف زرداری کی حلف برداری کے وقت انہیں تین بحرانوں کا سامنا تھا۔ پہلا، معیشت بحران کا شکار تھی۔ دوسرا، مقامی طالبان کے خلاف جنگ بری طرح سے جاری تھی اور تیسرے جب ان کی اہلیہ مرحومہ بے نظیر بھٹو وزیر اعظم تھیں بطور مسٹر ٹین پرسنٹ زرداری نے اپنی ساکھ کو بہتر نہیں بنایا، وہ اپنے ملک کو لالچ کی بنا پر لوٹ مار کرنے کے بجائے دانشمندی سے چلانے میں کم دلچسپی رکھتے تھے"۔

جناب چیئرمین! میں نے بڑے دکھ کے ساتھ یہ اقتباسات آپ کے سامنے پیش کیے ہیں۔ یہ صرف اس جذبے سے کیے ہیں کہ یہ ایک قومی ذمہ داری ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو صاحب ایوب خان کی حکومت میں وزیر رہے۔ چھ سال تک پاکستان کے وزیر اعظم رہے۔ کبھی ان کے بارے میں ایسی بات نہیں کہی گئی۔ پیپلز پارٹی کے دو ادوار جو اس سے پہلے گزرے ہیں ۱۹۸۵ء سے آگے اس کے متعدد وزیر اور مجھے یہ بات کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ہمارے آج کے قائدِ ایوان اور اعتزاز احسن اور دوسرے افراد کے بارے میں کبھی کوئی بات نہیں کہی گئی۔ لیکن اگر یہ باتیں کہی گئی ہیں تو پھر صداقت ہے یا نہیں، یہ دعوؤں سے ثابت نہیں ہوگی بلکہ یہ کسی طریقۂ کار سے ثابت ہوگی۔ اس لیے اگر آپ فی الحقیقت بیمار تھے اور اس حالت میں نہیں تھے اور آپ کی ذہنی طور پر یہ کیفیت تھی کہ سوئٹزرلینڈ کی عدالت میں پیش نہیں ہو سکتے تو سوال یہ ہے کہ ایک سال پہلے تک کی وہ رپورٹ جو آپ ہی کے وکیل نے دی ہے اور آپ ہی کے ڈاکٹر نے دی[1]، وہ صحیح تھی یا غلط۔ اگر وہ صحیح تھی تو پھر پریشانی کی بات ہے۔ اگر وہ غلط تھی تو دھوکا ہے۔ اور پھر سوال بھی اٹھایا جائے گا کہ ملک میں اور ملک کے باہر عدالتیں فیصلہ نہیں کر سکتیں اور اتنا وقت لگا تو اس میں کس نے اور کتنی تحریک التواء پیش کیں۔ کس نے کتنی بار التواء کے مطالبے کیے اور یہ کس کے وکیل نے کیے۔ یہ سارے حقائق دیکھنے پڑیں گے۔ آپ کو اپنا دامن صاف دکھانا ہوگا۔ تب ہی قوم اعتماد کرے گی۔

---

[1] پاکستان کے صدارتی انتخابات میں جناب آصف علی زرداری کے امیدوار ہونے کے بعد مغربی میڈیا، وال اسٹریٹ جرنل، فنانشل ٹائمز وغیرہ میں جناب زرداری کی نفسیاتی و جسمانی صحت کے حوالے سے خصوصی رپورٹس شائع ہوئی تھیں۔

فنانشل ٹائمز کے مطابق جون ۲۰۰۵ء سے ستمبر ۲۰۰۷ء تک جناب آصف علی زرداری ماہرین نفسیات کے زیر علاج رہے جن میں نیویارک کے ماہرین نفسیات ڈاکٹر اسٹیفن رچ اور فلپ سالٹیل کے مطابق اپنی سیاسی زندگی میں طویل قید کے دوران دی گئی اذیتوں کے سبب جناب آصف علی زرداری ڈپریشن، ذہنی کھچاؤ اور یادداشت کے محو ہو جانے کے امراض کا شکار ہیں۔ حتٰی وہ اپنی بیوی اور بچوں کی سالگرہ کے دن بھی بھول گئے ہیں۔

مذکورہ بالا ڈاکٹروں کی رپورٹس کو جناب آصف علی زرداری کے وکلاء نے ان کے دفاع میں پیش کر کے ان کی عدالت میں پیشی اور دفاع سے معذوری ظاہر کی۔ جس پر مقدمہ بند کر دیا گیا۔ لیکن اس کے فوراً بعد پرویز مشرف سے این آر او ملتے ہی ایک متحرک سیاسی لیڈر کے طور پر جناب آصف علی زرداری دوبارہ سرگرم ہوئے تو ان کی بیماریوں اور میڈیکل رپورٹس مشکوک ہو گئیں کہ یا تو وہ میڈیکل رپورٹ جھوٹی تھیں یا وہ پاکستان جیسے بحران کا شکار ملک کی صدارت کے قابل نہیں ہیں۔ لیکن جناب آصف علی زرداری کے قریبی دوستوں جناب حسین ہارون اور واجد شمس الحسن نے میڈیا کو بتایا کہ جناب آصف علی زرداری گزشتہ تین برسوں میں علاج کے بعد اب بالکل صحت مند ہیں۔

صدارتی منصب کا سیاست میں آلودہ ہونا

جناب چیئرمین! میں آخری بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایک اور پہلو جس سے مجھے مایوسی ہوئی ہے وہ زرداری صاحب کا پارٹی صدر کی حیثیت کو جاری رکھنا ہے۔ یہ بات متوقع تھی کہ جناب آصف علی زرداری صاحب صدارت کی ذمہ داری اٹھانے سے پہلے یا اس کے فوراً بعد سیاسی پارٹی کی قیادت سے دستبردار ہو جائیں گے۔ میں آپ کو یاد دلانا چاہوں گا کہ صدارتی انتخاب سے دو دن قبل وزیر اعظم صاحب نے قومی اسمبلی میں اس بات کا اعلان کیا تھا اور ٹی وی کے ذریعے ساری دنیا تک یہ پیغام پہنچا تھا کہ صدر جو بھی ہو گا وہ غیر سیاسی ہو گا، وہ غیر جانبدار ہو گا، وہ دستور کے مطابق فیڈریشن کی علامت ہو گا۔ یہ ان کے الفاظ ہیں۔ آپ یہ منگوا کر دیکھ لیجیے۔ میں نے خود ٹی وی پر ان کی یہ تقریر سنی تھی۔ یہ تقاضا تھا اس بات کا کہ اس سے پہلے کہ زرداری صاحب جوں ہی صدر بنتے، صدارت کی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد اپنے آپ کو پارٹی سے غیر متعلق کر لیتے۔

آصف زرداری صاحب کا یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں ہے کہ اس سے پہلے کسی صدر نے اپنے اختیارات نہیں چھوڑے۔ جناب فاروق لغاری صاحب تھے، ان کے بارے میں کسی فرد کی کوئی بھی رائے ہو لیکن یہ سچ ہے کہ ان کی صدارت کے زمانے میں پارلیمنٹ نے دستوری ترمیم کی اور اس دستوری ترمیم پر دستخط کر کے وہ اپنے اختیار سے دستبردار ہوئے۔ اس سے پہلے بھی ہوا ہے، آج بھی ہونا چاہیے۔ زرداری صاحب کو ہم نے کھلے دل سے تسلیم کیا ہے۔ ہم ان کو دستوری صدر مانتے ہیں۔ ہم نے ان کو ووٹ نہیں دیا لیکن انتخاب کے بعد ہماری خواہش تھی کہ وہ پورے پاکستان کے صدر ہوں اور وہ دستور کے تقاضے پورے کریں اور ان میں سے ایک بڑا اہم تقاضا یہ ہے کہ انہیں سیاسی جماعت کی سربراہی سے دستبردار ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر ان کی صدارت سیاست سے آلودہ رہے گی۔ ساتھ ساتھ میں یہ بھی کہہ دوں کہ ان کو اپنے بیان میں ذرا زیادہ ذمہ داری کا ثبوت دینا چاہیے۔ Wall Street Journal کو انہوں نے جو انٹرویو دیا، اس کے بعد جب شیری رحمٰن نے اس کو دھونے کی کوشش کی تو آپ کو معلوم ہے کیا ہوا؟

Wall Street Journal نے تردید کرتے ہوئے اپنی ویب پر انٹرویو کا وہ حصہ ان کی آواز میں سنا دیا[1]۔ یہی معاملہ اس وقت ہوا جب انہوں نے خواتین کے بارے میں ایک بے ہودہ بات کہی، بعد میں انکار کیا اور پھر وہاں کے پریس نے ان کی آواز میں اسے سنا دیا۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ کل انہوں نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ جسٹس افتخار چوہدری سیاست میں آجائیں، یہ ایک غیر ذمہ دارانہ بیان ہے۔ ان کو سمجھنا چاہیے کہ وہ کتنے نازک مقام پر ہیں اور میں اسی لیے کہتا ہوں کہ ان کو سیاسی طور پر پارٹی سے اپنے آپ کو علیٰحدہ کر کے، پارٹی کی سیاست سے بالا ہو کر، ملک، قومی مفاد، فیڈریشن اور دستور کے فریم ورک میں کام کرنا چاہیے۔

زرداری صاحب نے یہاں (پارلیمنٹ میں) دو ہفتے کے اندر آکر اچھی روایت قائم کی ہے۔ میری یہ دعا ہے، خواہش ہے بلکہ میرا مطالبہ ہے کہ باقی تمام معاملات میں بھی وہ ملکی دستور، سماجی اقدار اور سیاسی روایات کے مطابق کام کریں۔ مجھے توقع ہے کہ اس طرح پاکستان جمہوری عمل میں آگے بڑھ سکے گا۔ جمہوری روایات اور آئین سے جو انحراف رونما ہوئے، ان انحرافات کو دوام نہ بخشیں۔ ہر آئینی انحراف ایک مصیبت ہے۔ ایک دراڑ ہے۔ اسے بند کیجیے۔ اگر انحرافات کا فائدہ اٹھائیں گے، محض اس لیے کہ آج آپ اقتدار میں ہیں، تو آپ بھی اس کی غلط مثال قائم کریں گے، جیسا کہ مشرف نے قائم کی یا یحییٰ، ضیاء اور ایوب نے کی۔ خدا کے لیے اس سے بچیے۔ یہی راستہ آپ کے لیے اور ملک و قوم کے لیے اچھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پیپلز پارٹی سیاسی مستقبل کا رخ متعین کرے کہ وہ کس حد تک ان چیلنجز کا سنجیدگی، یکسوئی اور واضح مقصد کے ساتھ اور مہارت کے ساتھ سامنا کرے گی۔ اگر آپ نے

---

[1] وال اسٹریٹ جرنل میں ۱۴ اکتوبر ۲۰۰۸ء کو شائع شدہ صدر آصف علی زرداری کے انٹرویو کے حوالے سے بریٹ اسٹیفن کے آرٹیکل کے مطابق جناب آصف علی زرداری نے کہا کہ "انڈیا پاکستان کے لیے کبھی بھی خطرہ نہیں رہا" اس کے علاوہ انہوں نے پاکستان کے عمومی مؤقف کے خلاف مقبوضہ کشمیر میں سرگرم "سپاہ آزادی" کو "دہشت گرد" قرار دیا۔ بعد ازاں جب ملک کے اندر سیاسی قائدین نے اس پر شدید تنقید کی تو اس وقت کی وزیر اطلاعات شیری رحمٰن نے اس کی تردید کی لیکن وال اسٹریٹ جرنل نے اپنی ویب سائٹ پر جناب آصف علی زرداری کے یہ جملے خود ان کی آواز میں سنوا دیے۔

یہ نہیں کیا تو پاکستانی عوام احتساب کرنے میں بڑے مؤثر ہیں۔ ماضی میں بھی انہوں نے کیا ہے، آئندہ بھی وہ کریں گے۔ ہم سب کو مل کر جمہوریت کے فروغ کی کوشش کرنی چاہیے۔ اسی میں اس ملک کے لیے بہتری ہے۔

امریکی کارروائیوں پر ردِ عمل

جناب چیئرمین! میں اپنے بھائی میاں رضا ربانی کی دل سے بہت قدر کرتا ہوں اور سچی بات یہ ہے کہ اس پورے زمانے میں جب انہوں نے میرے ساتھ کام کیا ہے، خواہ وہ اس وقت میرے ساتھ اپوزیشن میں تھے یا اب حکومت میں ہیں، انہوں نے دیانت، سمجھداری اور تحمل کے ساتھ معاملات کو ڈیل کیا ہے۔ میں ان کی بہت قدر کرتا ہوں اور ان سے مجھے بڑی توقعات ہیں۔ لیکن ذاتی وضاحت کے ذیل میں کہنا چاہتا ہوں کہ شاید اس وقت وہ میری بات کو اپنے جوش جذبات میں پوری طرح سمجھ نہیں سکے[1]۔ مجھے اعتراف ہے کہ جب تین ستمبر ۲۰۰۸ء کو زمینی افواج امریکہ نے اتاریں اور انگور اڈا وزیرستان میں ہمارے پانچ گھروں کو تباہ کیا، بچوں اور عورتوں کو مارا، اس وقت حکومت نے اچھے اقدام کیے۔ ایک مؤثر احتجاج حکومت کا ہوا اور دوسرے زمین پر کم از کم کچھ ایسی سرگرمیاں ہوئیں، جن سے امریکہ کو یہ پیغام گیا کہ حکومت اب زبانی جمع خرچ ہی نہیں، شاید قوم کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے عملاً کچھ کرنے کو تیار ہے۔ اس کے دو معنی نکلتے ہیں۔ ایک یہ کہ ٹھیک ہے چاہے پانچ گھنٹے بعد

---

[1] سینیٹ میں پیپلز پارٹی کے قائدِ ایوان میاں رضا ربانی نے پروفیسر خورشید احمد کی تقریر کے درمیان وضاحتی نکتہ پر بتایا کہ ڈرونز حملوں، Hellfire missile حملوں اور انگور اڈا پر امریکی حملے کے حوالے سے حکومت پاکستان نے فوری کارروائی کی ہے اور حکومت کے سیکورٹی ایڈوائزر جنرل محمود درانی نے امریکہ کا ہنگامی دورہ کر کے صدر امریکہ کے قومی سلامتی کے مشیر اسٹیون ہیڈلی سے ملاقات میں امریکی حملوں پر حکومت پاکستان کی ناراضگی کا اظہار کیا ہے جس کے بعد امریکہ زمینی حملوں کے حوالے سے اپنے مؤقف سے پیچھے ہٹ گیا ہے۔ جبکہ انگور اڈا پر امریکی زمینی حملے پر پاکستان کے فوری اور سخت ردعمل پر امریکی حیران ہیں۔ امریکی ڈرونز حملوں اور پیش بندی کے طور پر حملوں میں پاکستان اور امریکہ میں جو مفاہمت ہوئی تھی وہ بھی پیچھے چلی گئی ہے۔

ہی سہی لیکن فوجی آئے[1]۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ رد عمل ہوا۔ دوسرا یہ کہ کم از کم ایک دن سپلائی کے ٹرکوں کو چھ گھنٹے کے لیے روکا گیا۔ یہ دونوں اقدامات بڑے مفید تھے اور ان کا پیغام حملہ آور فوج کو گیا اور اسی وجہ سے رپورٹ میں وہ بات آئی، جس کو رضا ربانی صاحب نے پڑھا ہے، میں نے اس رپورٹ کو پڑھا ہے۔ یہیں نہیں پڑھا ہے بلکہ میں نے اس کو ہر اخبار میں پڑھا ہے۔ حکومت نے اس کے بعد امریکی فوج کی جانب سے زمینی آپریشن جس کی بش نے جولائی میں سرکاری طور پر اجازت دی اس بارے میں امریکہ نے تھوڑا سا تحفظ لیا۔ میرا اس وقت اعتراض اس پر نہیں تھا۔ میرا اعتراض میکانیکی طریقۂ کار پر تھا۔ میرا اعتراض Hellfire missiles پر تھا جو ڈرونز کے ذریعے آرہے ہیں اور اس کے بارے میں، میں نے شائع شدہ رپورٹ کا جو اقتباس دیا ہے اس میں امریکی نمائندوں نے اس کو ختم کرنے کی کوئی بات نہیں کی بلکہ مانا ہے کہ ہم نے اگست سے اب تک ۱۹ بار ایسے حملے کیے ہیں۔ یہ حملے اس سے پچھلے مہینے کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں اور ساتھ یہ خطرناک بھی ہیں۔ اقتباس کا، اگر وہ صحیح ہے، میں نے آپ سے کہا ہے کہ تحقیق کیجیے، میں نے یہ نہیں کہا کہ میں الزام لگا رہا ہوں۔

اسی طرح 'Morning News' نے یہ کہا ہے کہ ہمارے سفیر نے بڑے خوبصورت انداز میں کہا، اور میں ان کی صلاحیتوں کا قائل ہوں کہ ٹیکنالوجی کے معاملات میں ہمارے درمیان ایک مفاہمت ہے۔ لیکن یہ ٹیکنالوجی کیا ہے؟ یہ پریڈیٹرز ہیں، ڈرونز ہیں، آپ اس کا جواب دیجیے اور میں زمینی آپریشنز کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ میں کہہ رہا ہوں کہ پریڈیٹروں کے ذریعے اور Hellfire missiles کے ذریعے خود مختاری کی جو خلاف ورزی چالیس کلومیٹر تک

---

[1] ۳ ستمبر ۲۰۰۸ء کو افغانستان میں موجود اتحادی فوجوں نے امریکی قیادت میں تین ہیلی کاپٹروں کی مدد سے وزیرستان میں انگور اڈا کے مقام پر حملہ کیا جس میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۲۰ اور غیر سرکاری طور پر ۲۷ افراد جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے، کی شہادتیں ہوئی، اس حملے کے دوران ہیلی کاپٹر پاکستانی سرزمین پر کئی گھنٹے موجود رہے اور فوجیوں نے وہاں اندھا دھند فائرنگ کی۔ اس طرح پہلی بار پاکستانی سرزمین پر باقاعدہ فوجی حملہ کیا گیا۔ اس موقع پر پاکستانی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں نے بھرپور احتجاج کیا۔ صدر پاکستان نے بھی پاکستانی سرحدوں کی اس خلاف ورزی کی مذمت کی۔

دعویٰ کرتے ہوئے امریکہ کر رہا ہے، اس کو روکنے کے لیے آپ کیا کر رہے ہیں؟ اس کے لیے محض احتجاج کافی نہیں ہے۔ اس کے لیے آپ کو وہی راستہ اختیار کرنا پڑے گا، چاہے اس کو "کڑاکا" کہیں یا جو بھی کہیں، جو آپ نے تین ستمبر (۲۰۰۸ء) (تفصیل پچھلے صفحہ پر فٹ نوٹ میں) کے موقع پر اختیار کیا اور صحیح اختیار کیا کہ فوج یہ واضح پیغام دے کہ ہم میں جواب دینے کی صلاحیت ہے اور ہم جوابی کارروائی کریں گے۔

سپلائی لائن، جو ان کی شہ رگ ہے، آپ اس کو چیک کیجیے۔ کنٹرول کیجیے تو آپ دیکھیں گے کہ پریڈیٹر بھی نہیں آئیں گے۔ لیکن اگر آپ یہ اختیار نہیں کریں گے، محض زبانی احتجاج کرتے رہیں گے تو یہ حملے ہوتے رہیں گے۔ ہمارے لوگ شہید ہوتے رہیں گے۔ ہماری خود مختاری کی خلاف ورزی ہوتی رہے گی، آپ ہاتھ ملتے رہیں گے اور اقدامات کے بارے میں سوچتے رہیں گے۔ آپ ہاتھ ملتے رہیں، یہ کافی نہیں ہے۔ میں چاہوں گا کہ آپ اس بارے میں تحقیق کریں جو امریکیوں نے دعویٰ کیا ہے اور جو آپ کے سفیر نے کہا ہے وہ کہاں تک صحیح ہے۔ اگر صحیح نہیں ہے تو ایوان کو بتایئے۔ اگر صحیح ہے تو سفیر کی گرفت کیجیے۔ (۲۸ اکتوبر ۲۰۰۸ء)

باب نمبر ۶

اچھی حکمرانی کا فقدان

- ۱ -

[آصف علی زرداری کے خطاب پر تبصرہ (۲۰۱۰ء)]

صدرِ پاکستان آصف علی زرداری کے ۲۰۱۰ء میں پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب میں ۱۸ویں ترمیم کی منظوری، این ایف سی ایوارڈ کا اجراء اور آغازِ حقوقِ بلوچستان کی جانب اشارہ کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ انہوں نے عمومی طور پر معاشی، تعلیمی اور سیاسی شعبوں میں حکومت کی کارکردگی بیان کی۔ سینیٹر پروفیسر خورشید نے جہاں حکومت کے مثبت اقدامات کو سراہا وہیں اچھی حکمرانی کے تناظر میں واضح کیا کہ این ایف سی ایوارڈ کو متفقہ منظوری کے بعد تبدیل کر کے کس طرح آئین کی خلاف ورزی کی گئی ہے اور آغازِ حقوقِ بلوچستان پیکیج کے سلسلہ میں جو وعدے کیے گئے تھے ان میں کیسے دھوکہ دیا جارہا ہے۔ پی پی کے دورِ حکومت کے دو سالوں میں کرپشن میں بے پناہ اضافے کے ساتھ حکومتی وعدوں کے برعکس توانائی اور معاشی بحران میں کس قدر اضافہ ہورہا ہے۔ دوسری جانب جناب آصف علی زرداری اپنی کرپشن پر سوئس مقدمات کے حوالے سے عوامی عہدوں پر فائز عہدیداروں کے خلاف کارروائی کے آئینی استثنیٰ کے قانون کا کس طرح غلط سہارا لے رہے ہیں۔ نیز یہ کہ دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ میں شراکت دار بننے سے پاکستان کو کس قدر جانی ومالی نقصان اٹھانا پڑا ہے۔

جناب چیئرمین! آپ جانتے ہیں کہ صدر کا خطاب پارلیمانی زندگی میں بڑی اہمیت کا حامل ہے اور غالباً صدر کا خطاب اور دوسرا بجٹ، دو ہی مواقع ایسے ہیں، جب ایوان کے اراکین ہر مسئلے پر اپنی رائے دے سکتے ہیں۔ صدر کے سالانہ خطاب کی ایک خاص حیثیت

ہے۔ جس طرح بجٹ کی ایک خاص نوعیت ہوتی ہے کہ وہ پورے سال کا میزانیہ اور معاشی پالیسیوں کا آئینہ ہوتا ہے اسی طرح صدرِ مملکت کے خطاب کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگلے پارلیمانی سال میں قوم کے سامنے اور پارلیمنٹ کے سامنے قانون سازی اور پالیسی سازی کے بارے میں حکومت اپنا ایجنڈا اور پروگرام رکھتی ہے۔ اسی لیے یہ بات رکھی گئی ہے کہ صدرِ مملکت کے خطاب پر عمومی بحث ہو تاکہ پورے سال کے حکومت کے پروگرام پر کم از کم پارلیمنٹ اپنی ایک عمومی رائے دے سکے۔ تاریخی طور پر یہ ماڈل برطانوی پارلیمنٹ کا ہے اور ایک مفید چیز ہے چنانچہ برصغیر میں بھی اسی روایت پر کام ہو رہا ہے۔

صدر کی حیثیت اور صدارتی خطاب کا مقصد

اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے جناب چیئرمین، میں جب صدر آصف علی زرداری کے اس خطاب کو پڑھتا ہوں تو مجھے مایوسی ہوتی ہے اور اس مایوسی کی دو وجوہ ہیں۔ پہلی یہ ہے کہ صدر بلاشبہ اپنا ایک سیاسی نقطۂ نظر بھی رکھتا ہے اور اس کا ایک سیاسی پس منظر بھی ہوتا ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں لیکن جب وہ صدر منتخب ہو گیا اور اس نے یہ حلف اٹھالیا کہ اب وہ پاکستان کے دستور کا محافظ اور خادم ہے اور اس کے تابع ہے تو وہ وفاق کی علامت بن جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد اس کا کردار ایک پارٹی کے کارکن یا سربراہ کا نہیں رہتا، اس کا کردار مملکت کے صدر کا بن جاتا ہے۔

یہاں میں آپ کو خراج تحسین پیش کروں گا جناب چیئرمین! آپ بھی اور قومی اسمبلی کی اسپیکر محترمہ فہمیدہ مرزا صاحبہ بھی، دونوں کا ایک سیاسی پس منظر ہے، دونوں کو اپنی پارٹی نے نامزد کیا ہے لیکن جب آپ نے یہ ذمہ داری سنبھال لی تو آپ نے اس کے بعد ہمارے علم کی حد تک اس ایوان کے آداب کا لحاظ رکھا ہے۔ پارٹی کے نقطۂ نظر کو آپ نے ترجیح نہیں دی، یہی ہمیں صدر سے بھی توقع ہے۔ لیکن مجھے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ صدر صاحب کا یہ خطاب ایک سیاسی پارٹی کے شریک چیئرمین کا تبصرہ ہے۔ یہ صدر کا خطاب نہیں ہے۔ درحقیقت مجھے اس پر دکھ ہوا ہے اور میں تنقید کے لیے نہیں بلکہ نصیحت کے لیے یہ

بات کہنا چاہتا ہوں کہ صدر صاحب اور ان کی پارٹی کو سمجھنا چاہیے کہ کس سے، کب، کہاں اور کیا کام لیا جانا ہے؟ یہ آداب اگر ہم نے ملحوظ نہ رکھے تو بڑی بُری روایت قائم ہو گی اور یہ صدارت کے لیے بھی اور ملک میں جمہوریت کے مستقبل کے لیے بھی صحیح نہیں ہے۔

صدارتی خطاب کا مقصد: دوسری بات جناب چیئرمین! جیسا کہ میں نے ابھی اشارہ بھی کیا ہے یہ ہے کہ صدر کے خطاب کا اصل مقصد پارلیمانی سال میں قانون سازی اور پالیسی بیان کرنا ہوتا ہے۔ میں نے بار بار اس خطاب کو پڑھا ہے لیکن میں افسوس سے کہتا ہوں کہ نہ اس میں قانون سازی کا کوئی خاکہ ہے اور نہ ہی اس میں کوئی سیاسی یا معاشی پروگرام ہے۔ اس وقت ملک کے جو جلتے ہوئے مسائل ہیں ان کا بھی اس میں کوئی احاطہ نہیں کیا گیا ہے۔ اس حیثیت سے یہ بڑا ہی مایوس کن خطاب ہے۔

صدارتی خطاب میں کیے گئے وعدے

جنابِ والا! میرا تیسرا نکتہ صدرِ مملکت کے ماضی کے وعدوں اور ان پر عملدرآمد سے متعلق ہے کہ اس کے بغیر اچھی حکمرانی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس حکومت کے تیسرے سال کے آغاز پر میں آپ کو یاد دلاؤں کہ اس سے پہلے صدر صاحب نے جو خطاب کیے ہیں انہوں نے ان میں کس قسم کے دعوے اور وعدے کیے تھے اور امیدیں دلائی تھیں اور وہ کہاں تک پوری ہوئیں۔ مثال کے طور پر جنابِ والا! ۲۰۰۸ء کے خطاب میں صدر زرداری نے یہ فرمایا تھا کہ ایک کل جماعتی کمیٹی تشکیل دیں جو ۱۷ویں ترمیم اور ۵۸(۲)(بی) کے خاتمے کے لیے آئینی ترامیم پیش کرے۔ یہ خطاب ۲۰ ستمبر ۲۰۰۸ء کا ہے۔ پھر اس کے بعد انہوں نے یہی بات دوسرے خطاب میں بھی کہی۔ مئی ۲۰۰۹ء میں وہ کمیٹی بنی اور میں ریکارڈ پر یہ بات لانا چاہتا ہوں کہ وہ چیز جس کا وعدہ آپ نے انتخابات سے پہلے کیا تھا آپ نے اس پر عمل کرنے کے لیے ڈیڑھ سال لیا جو بہت ہی قابلِ گرفت ہے۔

مہنگائی کا خاتمہ اور غذائی تحفظ: دوسری بات یہ ہے جنابِ والا! کہ انہوں نے ۲۰۰۸ء کے

خطاب میں فرمایا تھا کہ حکومت کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ معاشی صورت حال ہے۔ ایسے حالات میں کہ اس کے عوام بھوک کا شکار ہیں زندہ نہیں رہ سکتے، حکومت کے سامنے یہ فوری حل طلب مسئلہ ہے۔ میں دہراؤں گا 'فوری حل طلب مسئلہ، مہنگائی کے ستائے ہوئے عوام کو غذائی تحفظ فراہم کرنا ہے'۔ یہ ۲۰۰۸ء کی بات ہے۔ اب اگر آپ ۲۰۱۰ء کے خطاب میں دیکھیں تو اس میں نہ مہنگائی کے مسئلہ کا ذکر ہے، نہ بے روز گاری کے بارے میں بات ہوئی ہے، نہ تحفظ کا مسئلہ بیان ہوا ہے۔ معاشی پالیسی کے معاملات کو دیکھیں تو اس عرصے میں آپ نے بے شرمی سے چار وزیر خزانہ بدلے ہیں[1]۔ ہر شخص ایک نئی پالیسی لے کر آیا ہے۔ قرضوں کا بار ان اڑھائی سال کے اندر ساڑھے تین ٹریلین روپے بڑھا ہے۔ قرضوں کے اخراجات اس وقت آپ کے بجٹ کا سب سے بڑا حصہ ہیں جو دفاع سے بھی آگے نکل گیا ہے۔ انتظامیہ اور ترقیات کی پوزیشن کیا ہے، اس کا کوئی ذکر اس خطاب میں نہیں ہے حالانکہ معیشت کو فوری حل طلب مسئلہ کہہ کر یہ وعدہ انہوں نے ۲۰۰۸ء میں کیا تھا۔

بجلی کی فراہمی: میں آپ کو ان کا ایک اور وعدہ بھی سناؤں جو آج بڑا مضحکہ خیز نظر آتا ہے حالانکہ اس وقت ہم ان کے اعلان پر بہت خوش ہوئے تھے۔ انہوں نے ۲۰ ستمبر ۲۰۰۸ء کو بجلی کی فراہمی کے بارے میں فرمایا تھا کہ ہم نے قلیل مدت اور طویل مدت منصوبے شروع کر دیے ہیں۔ ہم ایک ماہ میں تو شاید یہ اندھیرے دور نہ کر سکیں گے مگر ایک سال کے اندر اندر، میں دہراتا ہوں 'پاکستان ایک بار پھر روشن اور درخشاں ہو جائے گا'۔ لیکن آج اڑھائی سال کے بعد تاریکی اور زیادہ بڑھ چکی ہے۔ لوڈشیڈنگ زیادہ ہو رہی ہے اور صارفین پریشانی میں ہیں، صنعتیں تباہ ہیں اور زراعت نقصان اٹھا رہی ہے۔ آج بھی کراچی میں بارہ گھنٹے کی لوڈشیڈنگ ہو رہی ہے۔ اعلانیہ اور غیر اعلانیہ لوڈشیڈنگ کا کاروبار گرم ہے اور آپ نے فرمایا

---

[1] ان میں اسحٰق ڈار (۳۱ مارچ ۲۰۰۸ء تا ۱۲ مئی ۲۰۰۸ء)، نوید قمر (۱۲ مئی ۲۰۰۸ء تا ۸ اکتوبر ۲۰۰۸ء)، شوکت ترین (۸ اکتوبر ۲۰۰۸ء تا ۲۲ فروری ۲۰۱۰ء)، ایک بار پھر نوید قمر (۲۲ فروری ۲۰۱۰ء سے ۱۸ مارچ ۲۰۱۰ء) شامل ہیں۔ ۱۸ مارچ ۲۰۱۰ء کو ایک اور تبدیلی کے بعد عبد الحفیظ شیخ کو وزیر خزانہ بنایا گیا۔

تھا کہ ایک سال کے اندر اندر یہ ختم ہو جائے گی۔ ۲۰ ستمبر ۲۰۰۸ء، ۲۰ ستمبر ۲۰۰۹ء اور اب مئی ۲۰۱۰ء۔ آخر ہم کہاں ہیں ؟ اس قسم کی آپ شاعری فرمائیں اور دعوے کریں تو یہ دراصل پارلیمنٹ کو حقائق سے آگاہ کرنا نہیں ہے۔ بلکہ اگر میں یہ الفاظ استعمال کروں تو شاید بے جا نہ ہوں کہ یہ پارلیمنٹ کے ساتھ دھوکہ ہے اور یہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔

زراعت کی ترقی: جنابِ والا ! اسی خطاب میں فرمایا گیا تھا کہ زراعت کو اپنی ترجیحات میں اولین مقام دیا جائے گا اور یوں دیر پا غذائی تحفظ حاصل ہو سکے گا۔ روزگار اور آمدنی کے ذرائع میں اضافہ ہونے سے ہمارے لوگ، ہمارے دیہات، ہمارا تقریباً پورا ملک ترقی کرے گا اور پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار سرکاری سطح پر فصلوں کی انشورنس کا پروگرام بنایا جارہا ہے، یہ ستمبر ۲۰۰۸ء کا وعدہ ہے۔ یہی وعدہ ۲۰۰۹ء میں بھی کیا گیا ہے اور یہ خالی وعدہ ہے۔ آخر ہم کس کو دھوکا دے رہے ہیں۔ کیا ہمارا خیال یہ ہے کہ ہم جو چاہیں کہہ دیں اور عوام اس کو یاد نہیں رکھیں گے، پارلیمنٹ احتساب نہیں کرے گی۔ تو جنابِ والا ! میں نے ان تینوں تقاریر کو بہت غور سے پڑھا ہے اور مجھے بڑے دکھ سے کہنا پڑ رہا ہے کہ ان میں دعوے ہیں، ان میں غلط بیانیاں ہیں، ان میں شاعری ہے۔ لیکن جو چیز صدر کے خطاب کا حصہ ہوتی ہے وہ نہیں ہے۔ تو جنابِ والا ! میری نگاہ میں یہ نہایت ہی مایوس کن خطاب تھا۔

تعلیم کا مسئلہ: جناب چیئرمین ! تعلیم کا مسئلہ بھی اہم ہے۔ تعلیم کے سلسلے میں، میں آپ کو صدر صاحب کا ۲۰۰۹ء کا ارشاد گرامی سنانا چاہتا ہوں۔ مارچ ۲۰۰۹ء میں انہوں نے فرمایا تھا کہ ایک نئی تعلیمی پالیسی وضع کی جارہی ہے، اس کا ہدف ۲۰۱۰ء تک یونیورسل پرائمری تعلیم کا حصول ہے۔ میں اگلی بات بھی دہراتا ہوں۔ ۲۰۱۰ء، جس میں ہم ہیں، جو اب تقریباً آدھا گزر چکا ہے، اس میں ۲۰۱۰ء تک یونیورسل پرائمری تعلیم کا حصول اور ۲۰۱۲ء تک بجٹ میں جی ڈی پی کا چار فیصد حصہ تعلیم کے لیے مختص کیا جائے گا۔ جنابِ والا ! میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ تعلیمی پالیسی کہاں ہے ؟ ہم نے آج تک وہ پالیسی نہیں دیکھی۔

پرائمری تعلیم کا حال یہ ہے کہ ہمارے ۵۰ فیصد بچے آج بھی پرائمری تعلیم سے محروم

ہیں۔ جنہیں تعلیم مل رہی ہے ان میں چھوڑ جانے والوں کی شرح ۳۰ فیصد سے ۳۵ فیصد ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تعلیمی بجٹ چار فیصد کر دیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ بجٹ دو فیصد سے بھی کم ہے۔ جنابِ والا! میرے پاس سارے اعداد و شمار موجود ہیں کہ اعلیٰ تعلیمی کمیشن نے احتجاج کیا کہ ہمارا بجٹ ۲۳ بلین تھا اسے کم کر کے ۱۸ بلین کر دیا گیا ہے۔ آپ نے بجٹ کم کیا ہے، بجٹ بڑھایا نہیں ہے۔ یہی صورت حال تعلیم کے ہر شعبے سے متعلق ہے۔ جنابِ والا! تعلیم کی ذمہ داری اور تعلیم کے بغیر کوئی قوم نہیں اُٹھ سکتی۔ تعلیم میں معیار کی بھی ضرورت ہے اور اسے عددی طور پر بڑھانے اور نظریاتی تناظر کی بھی ضرورت ہے۔ یہ تینوں چیزیں ضروری ہیں اور یہ تینوں چیزیں مفقود ہیں۔ جنابِ والا! یہ بڑی خطرناک صورت حال ہے۔

حکومتی کارکردگی کا جائزہ

دوسری بات جنابِ والا! اس خطاب میں کہی گئی ہے کہ آئین کا تقدس، پارلیمنٹ کی بالادستی، قانون کی حکمرانی، صوبائی خود مختاری اور معاشی استحکام، یہ پانچ چیزیں ہیں جن کو انہوں نے اپنے ریکارڈ میں پیش کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جنابِ والا! اسی پر حکومت کی کارکردگی کا جائزہ لیا جائے۔

جہاں تک آئین کا تعلق ہے، اس میں جو مثبت اقدام ہوئے ہیں میں ان کا خیر مقدم کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ حکومت کو اس کی شاباش ملنی چاہیے۔ اس سلسلے میں میری نگاہ میں انہوں نے تین اقدامات اچھے کیے ہیں۔ پہلا قومی مالیاتی ایوارڈ ہے۔ یہ اتفاق رائے سے آیا، ۱۵ سال کے بعد آیا۔ آپ نے اس میں کوشش کی اور پنجاب نے اس میں آپ کا ساتھ دیا لیکن اس پر مبارکباد آپ کا استحقاق ہے اور میں اسے سراہتا ہوں۔ دوسری اہم پیش رفت ۱۸ویں ترمیم ہے۔ یہ بہت بڑا کارنامہ ہے بشرطیکہ ایمانداری سے اس پر عمل درآمد ہو۔ تیسری چیز آغازِ حقوقِ بلوچستان ہے۔ یہ ایک بڑی اہم ضرورت تھی۔ اگرچہ یہ ایک ناکافی پروگرام تھا لیکن آپ نے ایک اقدام کیا جس کی میں تحسین کرتا ہوں۔ تاہم میں چاہتا ہوں کہ ان تینوں باتوں پر آپ اس حوالہ سے غور کریں کہ بعد میں پیش رفت کیا ہوئی ہے اور کس طرح ہوئی ہے۔

قومی مالیاتی ایوارڈ: قومی مالیاتی ایوارڈ کی اہمیت کے بارے میں دو آراء نہیں۔ آپ نے گوادر جا کر ایک بہت بڑا جلسہ اور تماشا کر کے کروڑوں روپے خرچ کر کے اس کا اعلان کیا۔ اس کے بعد ایوانِ صدر میں ایک بہت ہی عظیم تقریب منعقد کر کے آپ نے اس پر دستخط کیے۔ لیکن جنابِ والا! مجھے یہ کہتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ اس دستخط کے بعد اس ایوارڈ میں تبدیلیاں کی گئیں اور یہ سرکاری اعلان ہوا ہے کہ یہ نظر ثانی شدہ ایوارڈ آیا ہے۔ نظر ثانی کرنے کا حق کس کو ہے؟ نظر ثانی کرنے کا حق آپ کو تو نہیں ہے۔ اگر ہے، حالانکہ اس کے بارے میں دو آراء ہو سکتی ہیں، تو وہ نیشنل فنانس کمیشن کو ہے۔ صدر کا یہ کردار ضرور ہے کہ اگر این ایف سی ناکام ہو جائے تو دستور کی رو سے حکم کے ذریعے وہ ایوارڈ دے سکتا ہے۔ لیکن جس ایوارڈ کو کمیشن نے متفقہ طور پر منظور کر کے دیا ہو، صدر نے دستخط کر دیے ہوں تو اس دستخط کے بعد اس میں تبدیلی نہیں لائی جا سکتی۔ جنابِ والا! یہ بات میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ سندھ کے صوبے کے وزیر اعلیٰ نے سرکاری طور اس پر اعتراض کیا ہے کہ این ایف سی ایوارڈ کے طے کیے جانے کے بعد اس میں تبدیلی کی گئی ہے اور یہ صحیح نہیں ہے۔ اس پر بلوچستان کے ساتھیوں نے احتجاج کیا ہے اور انہوں نے کہا کہ ہم ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ تو جنابِ والا! یہ بڑا سنجیدہ مسئلہ ہے۔ ایک طرف تو آپ دستور کا حلف لیتے ہیں، ایک طرف آپ این ایف سی کا ایک قابلِ تعریف فیصلہ کرتے ہیں لیکن اس کے بعد آپ اس میں تبدیلی لاتے ہیں جو درست نہیں ہے۔

حقوق بلوچستان پیکیج[1]: اسی طریقے سے آپ آغاز حقوق بلوچستان کو لیجیے۔ اس کا اعلان کیے ہوئے ۶ مہینے ہو چکے ہیں۔ کہا گیا تھا کہ سات دن کے اندر اس پر عمل شروع ہو جائے گا اور وہ چوکیاں ختم ہو جائیں گی جن پر لوگوں کو اعتراض اور شکایت ہے۔ وہ ساری چوکیاں آج تک

[1] باب کے اختتام پر آغازِ حقوقِ بلوچستان پیکیج کی تفصیلات دی گئی ہیں۔

ختم نہیں کی گئیں اور اگر کہیں ختم ہوئی ہیں تو وہاں یہ دھوکہ اور فراڈ کیا گیا ہے کہ ایک مقام سے ہٹا کر اس سے ۵۰۰ میٹر دور دوبارہ قائم کی گئی ہیں۔ کیا قانون اور دستور پر عمل اور خود اپنے فیصلوں کو نافذ کرنے کا یہی طریقہ ہے؟ اس طرز عمل کا ہی نتیجہ ہے کہ خود آپ کی حکومت، صوبے کا گورنر نواب ذوالفقار علی خان اور وزیر اعلیٰ نواب اسلم خان رئیسانی دونوں کہہ رہے ہیں کہ ہم غیر مطمئن ہیں اور گورنر تو استعفیٰ دینے کی بات کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میرا استعفیٰ قبول کر لو، یہ ہمارے ساتھ مذاق ہو رہا ہے۔ جنابِ والا! قانون اور دستور کی بالادستی اس طرح نہیں ہو سکتی۔

۱۸ویں ترمیم اور قانون کی بالادستی: میں ۱۸ویں ترمیم کے بارے میں اب بھی توقعات رکھتا ہوں۔ میں نے خود اس کی تیاری اور تکمیل میں کردار ادا کیا ہے اور ہمیں اس پر فخر ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس ۱۸ویں ترمیم کے بعد دستور کے نفاذ کے سلسلے میں جو پہلا قانون آیا اس میں اسلام آباد ہائی کورٹ کے ججز کے تعین اور چیف جسٹس کی تقرری کے بارے میں دستور میں وضاحت شامل کر دی گئی ہے۔ میں ممنون ہوں کہ سینیٹ کے اقدام پر لیڈر آف دی ہاؤس اور وزیرِ قانون بابر اعوان نے تعاون کیا اور دستور کی ایک واضح خلاف ورزی کو دور کر دیا گیا۔ یہ اچھی بات ہے لیکن سوال تو یہ ہے کہ جس دستور کا آپ کریڈٹ لے رہے ہیں اس کے نفاذ کے بارے میں پہلا قدم جو آپ نے اٹھایا ہے کیا وہ کافی ہے؟

اسی طریقے سے جنابِ والا! قانون کی حکمرانی نام ہے سپریم کورٹ کے احکام کی تعمیل کا۔ سپریم کورٹ کے احکام سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور اختلاف کرنے کے بھی دو راستے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ آپ عدالتی کارروائی اسمبلی میں لائیں۔ لیکن اگر کوئی ایسا مسئلہ ہے کہ آپ اس سے اتفاق نہیں کرتے تو بلاشبہ پارلیمنٹ کے ذریعہ آپ کو قانون سازی کا اختیار حاصل ہے۔ پارلیمنٹ قانون سازی کرتی ہے عدلیہ تشریح کرتی ہے۔ عدلیہ کی تشریحات کو ماننا پڑتا ہے۔ لیکن اگر عدلیہ کی تشریحات سے اختلاف ہو تو پارلیمنٹ ترمیم کے ذریعے اپنی رائے کا اظہار کر سکتی ہے۔ لیکن آپ کیا کر رہے ہیں؟ آپ عدلیہ کے احکام پر عمل نہیں کر رہے ہیں۔

سپریم کورٹ کہہ رہی ہے کہ سوئس مقدمات کا جائزہ لو[1]۔ آپ کہتے ہیں کہ میری لاش پر سے گزرنا ہو گا۔ آپ پریشانی پیدا کر رہے ہیں۔ اٹارنی جنرل استعفیٰ دیتا ہے، متعلقہ وزارت کے دونوں سیکرٹریز، جوائنٹ سیکرٹری اور نیب کے افسران مستعفی ہو جاتے ہیں لیکن آپ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ یہ کیا پیغام آپ دے رہے ہیں؟ جنابِ والا! میں صاف عرض کرتا ہوں کہ جب تک ہر ادارہ اپنے دائرے میں کام نہ کرے اور دوسرے اداروں کا احترام نہ کرے تو تصادم کا خدشہ ہوتا ہے۔ میں تصادم کے تناظر کے حق میں نہیں ہوں اور اب بھی میں التماس کرتا ہوں کہ تصادم کی کوئی صورت پیدا نہ ہو اور نہ ہونی چاہیے۔ اس میں سپریم کورٹ کو بھی احتیاط برتنی چاہیے اور حکومت کو بھی قانون کی پاسداری کرنی چاہیے۔

---

[1] ۱۹۹۷ء میں میاں نواز شریف نے وزیر اعظم منتخب ہونے کے بعد ۱۹۹۸ء میں بے نظیر بھٹو کے شوہر جناب آصف علی زرداری کے خلاف حکومت پاکستان کے مختلف ٹھیکوں میں بطور رشوت چھ کروڑ ڈالر لے کر منی لانڈرنگ کے ذریعے سوئس بینکوں کے اکاؤنٹس میں رکھنے کا الزام لگایا اور سوئٹزرلینڈ کی عدالت میں مقدمہ درج کرا دیا۔ سوئس عدالت نے ۱۹۹۸ء سے ۲۰۰۳ء تک مقدمہ کی تفتیش اور سماعت کے بعد بے نظیر بھٹو اور آصف علی زرداری کو قصوروار قرار دیا اور ایک لاکھ ڈالر جرمانہ ادا کرنے اور بیس لاکھ ڈالر حکومت پاکستان کو واپس کرنے کا حکم دیا۔ علاوہ ازیں جج ڈینیل ڈیواوڈ نے ۲۰۰۳ء میں آصف علی زرداری اور بے نظیر بھٹو کو چھ چھ ماہ قید اور ان کے جنیوا میں وکیل کو چار ماہ قید کا حکم دیا۔ جج نے سوئس بینک میں موجود ان کی تمام رقم بھی ضبط کرنے کا حکم دیا۔

بعد ازاں ۲۰۰۷ء میں پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن بے نظیر بھٹو نے صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف سے مذاکرات کر کے ایک معاہدہ کیا جس کے نتیجے میں صدر پاکستان نے پی پی پی کی قیادت اور لیڈروں و کارکنوں کو بشمول آصف علی زرداری عام معافی دے دی تاکہ وہ پاکستان آ کر سیاسی عمل میں شرکت کریں۔

اگست ۲۰۰۸ء میں جنیوا کے اٹارنی جنرل ڈینیل زے پیلی (Daniel Zappelli) نے بڑے پیمانے پر منی لانڈرنگ کے تمام مقدمات کو اپنے دائرہ اختیار میں لینے کے بعد غیر متوقع طور پر اگست کے آخر میں ممکنہ طور پر سیاسی وجوہات کے سبب اس سلسلے میں تمام کارروائی ختم کر دی اور ضبط شدہ رقم ریلیز کر دی گئی۔ ۲۰۰۹ء میں چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری نے سوئس مقدمات کو از سرِ نو کھولنے کا حکم دیا اور حکومت پاکستان کو حکم دیا کہ وہ سوئٹزرلینڈ کی عدالت کو خط لکھے لیکن وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے یہ مؤقف اختیار کرتے ہوئے کہ آصف علی زرداری کو بطور صدرِ مملکت مامونیت (استثنیٰ) حاصل ہے خط نہیں لکھا۔ جس پر چیف جسٹس نے توہینِ عدالت کے جرم میں یوسف رضا گیلانی کو سزا سنا دی جس کے نتیجے میں انھیں وزیر اعظم پاکستان کے عہدے سے فارغ ہونا پڑا۔ (ماخذ: روزنامہ ڈان ۳۰ جون ۲۰۱۲ء)

پارلیمنٹ کو بھی اپنا کردار ادا کرنا چاہیے لیکن حکومت کا رویہ منفی ہے حکومت کا رویہ تضحیک کرنے اور پریشان کرنے کا ہے اور یہ کسی طرح بھی درست رویہ نہیں ہے۔

جنابِ والا! میں یہ بات بھی آپ کے نوٹس میں لانا چاہتا ہوں کہ آرٹیکل ۲۴۸ دستور کا حصہ ہے اور ہم اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ لیکن آرٹیکل ۲۴۸ کی بھی تشریح کی جائے کہ کہاں وہ لاگو ہو گا اور کہاں لاگو نہیں ہو گا؟ آرڈیننسز کی تشریح کرنے کا حق انتظامیہ کا نہیں، عدلیہ کا ہے[1]۔

کرپشن کی صورتحال: قانون کی بالا دستی ہی کے ضمن میں دوسری عرض میں کرپشن کے بارے میں کرنا چاہتا ہوں۔ میری نگاہ میں سیاستدانوں کے لیے، انتظامیہ کے لیے اور ہر اہم عہدیدار کے لیے اہلیت کی کسی بھی دوسری شرط سے زیادہ اہم شرط یہ ہے کہ وہ ایماندار ہو، اس کے اندر کرپشن نہ ہو۔ لیکن آج عالم یہ ہے کہ کرپشن کا بازار ہر طرف گرم ہے۔ میں آپ سے بڑے دکھ سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ ورلڈ بنک کی رپورٹ میں یہ کہا گیا ہے کہ پاکستان میں پچھلے ۸ سال میں کرپشن میں چار گنا اضافہ ہوا ہے۔ ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کی ۲۰۱۰ء کی رپورٹ یہ ہے کہ صرف ایک سال میں یعنی ۲۰۰۹ء میں کرپشن میں ۱۰۰ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ تو ہمارا فرض ہے کہ کرپشن کو ہم ختم کریں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ وزیر اعظم، صدر، وزراء اور پارلیمنٹ کے ممبران سب اپنے آپ کو پیش کریں۔ ہمارا دامن صاف ہو گا تو ملک سے کرپشن دور ہو گی۔ ہمارا دامن داغدار ہو گا تو ملک میں کرپشن کو فروغ حاصل ہو گا۔ آرٹیکل ۲۴۸ کا سہارا لینا میری نگاہ میں ایک مجرم ضمیر کی گواہی دینا ہے۔

---

[1] آئین کے آرٹیکل ۲۴۸ کے مطابق صدر، گورنر، وزیر اعظم، وزیر اعلیٰ یا کوئی وزیر اپنے عہدے کے اختیارات کے استعمال کرنے پر کسی عدالت کے سامنے جوابدہ نہیں ہے اور عہدے کی معیاد کے دوران نہ ان پر مقدمہ قائم کیا جا سکتا ہے نہ ہی گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس شق کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی شخص وفاق یا صوبے کے خلاف مناسب قانونی کارروائی نہیں کر سکتا۔ آرٹیکل کے مطابق وفاقی اور صوبائی حکومت کے عوامی عہدوں پر فائز مذکورہ بالا عہدیداروں کے خلاف قانونی طریقۂ کار کے مطابق ۶۰ دن کے تحریری نوٹس پر مقدمہ درج کرایا جا سکتا ہے۔

اگر آپ نے کوئی خطا نہیں کی اور آپ کا دامن پاک ہے تو آپ کو پیش کش کرنی چاہیے کہ آؤ تحقیقات کرو یہی درست راستہ ہے۔ اس کے برعکس آپ سہارا لیتے ہیں کہ میں اتنے سال جیل میں رہا اور کوئی چیز ثابت نہیں ہوئی۔ میں کہتا ہوں کہ اتنے سال آپ جیل میں رہے کیا کسی عدالت نے آپ کو بری کیا؟ اگر عدالت نے بری نہیں کیا تو الزام باقی ہے۔ ٹھیک ہے، الزام ثابت ہو گا اور عدالت کے ذریعے جرم بنے گا، اس وقت تک آپ ملزم ہیں۔ لیکن کسی عدالت نے آپ کو آزاد نہیں کیا، بلکہ ایک پاکستانی اور ایک سوئس عدالت نے مجرم ٹھہرایا۔ ٹھیک ہے آپ نے اپیل کی لیکن یہ بہر حال رد ہوئی ہے۔

جنابِ والا! ساتھ ہی کئی اور چیزیں ایسی ہیں کہ جن کا جواب آنا بہت ضروری ہے۔ ان میں سرے محل سر فہرست ہے۔ آپ نے سرکاری طور پر یہ کہا کہ اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جب یہ معاملہ پہلی بار سامنے آیا اس زمانے میں محترمہ وزیر اعظم صاحبہ نے نیشنل اسمبلی کے فلور پر بھی یہ کہا کہ میرا اور زرداری کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن اب آپ ۲۰۰۷ء میں کہہ رہے ہیں کہ یہ آپ کا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر آپ نے پہلے جو کہا تھا وہ غلط تھا تو یہ جعل سازی ہے اور جعل سازی خود ہی ایک بہت بڑا جرم ہے۔ اور اگر آپ اب غلط بیانی کر رہے ہیں تو آپ اس کو ثابت کریں کہ اس محل کو آپ نے کیسے حاصل کیا تھا؟ وہ منی لانڈرنگ تھی یا کرپشن کا پیسا تھا۔ آخر ۴ ملین پونڈ کا مسئلہ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ سوئس بنک نے ۶۰ ملین ڈالر کا کہا ہے۔ یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ امریکہ کی سینیٹ کی کمیٹی کی رپورٹ کے اندر یہ کہا گیا ہے کہ ۱۱ ارب ڈالرز کے اکاؤنٹس ہیں اور ان اکاونٹس کی پوری فہرست موجود ہے۔ آپ کے اور آپ کی کمپنیوں کے نام ہیں۔ اگر یہ تفصیل درست نہیں ہے تو اس پر اعتراض کریں۔ الزامات کا سامنا کیجیے اور اپنے آپ کو صاف کروایئے۔

اگر سرے محل آپ کا ہی ہے تو پھر قوم کو بتایئے کہ اس کے لیے آپ کے پاس پیسہ کہاں سے آیا ہے؟ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ اس کا دعویٰ کر رہے ہیں تو ثابت کیجیے کہ

یہ کیسے آیا ہے ؟ اگر یہ آپ نے کمایا ہے، اور اس کمائی پر آپ نے ٹیکس دیا ہے تو آپ کا حق ہے آپ لے لیجیے۔ لیکن اگر یہ نہیں ہے تو پھر آپ ملزم ہیں اور الزام کا قانونی طور پر سامنا کرنے کی بجائے آرٹیکل ۲۴۸ کا سہارا لینا میری نگاہ میں سیاسی خودکشی ہے۔ یہ قانون اور دستور کے تقاضوں کو پورا کرنا نہیں ہے۔ اس طرح آپ اس سے کوئی تحفظ حاصل نہیں کر سکتے۔ تو جنابِ والا! میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ جو دعوے آپ نے اس معاملے میں کیے ہیں وہ بہت محلِ نظر ہیں، وہ صحیح نہیں ہیں آپ کو ان چیزوں کو درست کرنا ہو گا۔

اچھی حکمرانی کا مسئلہ

جنابِ والا! آج سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ملک میں 'اچھی حکمرانی' نہیں ہے بلکہ بُری حکمرانی ہے۔ سول سروس اور بیوروکریسی کا نظام کسی بھی حکومت کے لیے کام کا بنیادی فریم ورک ہوتا ہے لیکن آپ نے اس ادارہ کو تحفظ نہیں دیا۔ اس اہم ادارہ کو سیاست زدہ کیا جارہا ہے اور میں یہ بات صرف مرکز کے بارے میں نہیں کہتا۔ مرکز کے ساتھ ساتھ صوبوں کا معاملہ بھی یہی ہے۔ پنجاب کی حکومت بھی یہی کر رہی ہے۔ ہم کسی ایک کے ساتھ ناانصافی نہیں کرنا چاہ رہے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب تک سول سروس کو آپ دستوری تحفظ نہیں دیں گے، سیاسی مقاصد کے لیے اسے استعمال کرنا بند نہیں کریں گے اور انہیں یہ حق حاصل نہ ہو گا کہ وہ قانون، قواعد اور دستور کے مطابق کام کریں اس وقت تک اس ملک میں اچھی حکمرانی نہیں آسکتی ہے۔

آپ دیکھیے کہ آپ کے وزیراعظم نے ۵۴ تقرریاں اس طرح کی ہیں کہ سپریم کورٹ کو انہیں ختم کرنا پڑا۔ اس کے بعد بھی آپ سپریم کورٹ کے فیصلے پر عمل نہیں کر رہے۔ یہ کیا صورتِ حال ہے ؟[اچھی حکمرانی کے فقدان کے نتیجہ میں بہتری کی علامت کے طور پر پروفیسر خورشید احمد نے اس مرحلہ پر دو اہم عنوانات کی جانب خصوصی طور پر اشارہ کیا]

معاشی بحران: جنابِ والا! میں اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اس وقت ملک شدید معاشی بحران کا شکار ہے۔ پاکستان اکنامک سروے (۱۰-۲۰۰۹ء) کے مطابق آپ کی ترقی

کی نظر ثانی شدہ شرح ۲ء۱ فیصد (۲۰۰۸ء-۲۰۰۹ء) ہے، آبادی میں اضافہ ۳ء۰۵ فیصد ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم کہاں جارہے ہیں۔ قرضوں کے بوجھ اور مہنگائی کی صورت حال کو آپ دیکھ لیجیے۔ آپ نے کہا تھا کہ افراطِ زر ایک ہندسے تک آجائے گا۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ بے روزگاری ہے، ترقی مخالف، مالیاتی پالیسی، کرنسی پالیسی اور توانائی بحران، ان تینوں کی وجہ سے آپ کی صنعت دربدر ہے۔ وسائل بڑھ نہیں پارہے، پیداوار کی لاگت بڑھ گئی ہے اور ملک ایک معاشی بحران کی طرف بڑھ رہا ہے۔ زراعت میں صورت حال کچھ بہتر ہے لیکن بحیثیت مجموعی معیشت بڑی خطرناک صورت حال سے دوچار ہے۔ بدقسمتی سے لگتا یہ ہے کہ حکومت کو اس کا احساس تک نہیں ہے۔ تشویشناک صورت حال کے باوجود بھی ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے دباؤ پر آنکھیں بند کرکے قیمتیں بڑھائی جارہی ہیں۔

مشیر خزانہ کی میں عزت کرتا ہوں، وہ لائق آدمی ہیں۔ لیکن وہ ہمیں اس وقت یہ بتارہے ہیں کہ آئی ایم ایف کے آگے ہم مجبور ہیں۔ اس لیے گیس اور بجلی کی قیمتیں بڑھائیں گے اور زرِ تلافی بھی ختم کریں گے۔ بطور معیشت دان میں اس بات سے واقف ہوں کہ زرِ تلافی کے کیا منفی و مثبت اثرات ہوتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے امریکہ میں آج بھی ترقی کے باوجود زراعت کو زرِ تلافی دیا جاتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ پوری یورپی کمیونٹی میں زراعت پر تقریباً تین سو ارب سالانہ زرِ تلافی دیا جاتا ہے۔ زرِ تلافی ختم کرنے کی یہ ساری پابندیاں ہمارے لیے ہیں۔ میں اس کے حق میں ہوں کہ زرِ تلافی کو کم کیا جائے اور زرِ تلافی خاص شعبوں میں دیا جائے اور اسے حقیقی طور پر متوازن بنایا جائے۔ ہمارے ہاں مشکل یہ ہے کہ زرِ تلافی کا فائدہ بڑے زمیندار، جاگیر دار اور پیسے والے لوگ اٹھالیتے ہیں، اس سے عام آدمی کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ میری نگاہ میں زرِ تلافی کو اس شکل میں ہونے کی بجائے اخراجات کے حوالے سے ہونا چاہیے اور جو مستحق ہیں ان کے لیے ہونا چاہیے باقی لوگوں کے لیے نہیں۔ یہ کہنا کہ ہم زرِ تلافی کے ہاتھوں مجبور ہیں درست نہیں۔ اگر ایسا ہے تو پوری دنیا زرِ تلافی کے ہاتھوں پھنسی ہوئی ہے۔ اس طرح کے دعوے کرنا میرے خیال میں کسی صاحبِ علم کے لیے مناسب نہیں ہے۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ: جنابِ والا! میں آپ کی توجہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کی طرف بھی مبذول کروانا چاہتا ہوں۔ جنابِ والا! میرے پاس وزارتِ خزانہ کی سرکاری رپورٹ ہے جس میں انہوں نے یہ واضح کیا ہے کہ اس جنگ کے اولین سات سال میں پاکستان کی معیشت کو ۳۵ بلین امریکی ڈالر کا نقصان ہوا ہے۔ اگر آپ پورے دس سال لیں تو میں محتاط اندازے سے کہہ رہا ہوں کہ ۴۵ سے ۵۰ بلین ڈالر کا نقصان ہو چکا ہے۔ ہم نے اپنے فوجیوں سمیت ہزاروں افراد کی جانیں دی ہیں۔ بڑی تعداد میں معصوم انسان مارے گئے ہیں۔ دوروز قبل بوسٹن سے ایک تحقیقی رپورٹ آئی ہے جس میں انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ڈرون حملوں کے ذریعے اگر ایک مشتبہ شخص مارا جاتا ہے تو ۱۵۰ عام شہری مارے جاتے ہیں۔ ایک سے ۱۵۰ کا تناسب ہے۔ یہ میری رپورٹ نہیں ہے یہ بوسٹن کی تحقیقی رپورٹ ہے۔ یہی صورت حال آپ کے اپنے آپریشن کی ہے۔ فوجی جوان اور شہری جس طرح مارے جارہے ہیں اور مسلسل زخمی ہورہے ہیں یہ بے حد تشویشناک ہے۔ اندرون ملک بے گھر افراد کی مشکلات اس کے علاوہ ہیں۔

دوسری جانب اس عرصہ میں امریکہ نے آپ کو پندرہ بلین ڈالر دیے ہیں۔ اس پندرہ بلین میں سے نو بلین خدمات کا معاوضہ ہیں، اصل میں صرف چھ بلین ملا ہے۔ چھ بلین لے کر آپ نے ۵۰ بلین کا نقصان کیا ہے یہ کیسا کھیل اور کیسا سودا ہے؟

جنابِ والا! میں آپ کو یاد دلاؤں ۲۲ اکتوبر ۲۰۰۸ء کو، ڈیڑھ سال پہلے، پارلیمنٹ نے ایک مشترکہ قرارداد کے ذریعے کہا تھا کہ ہمیں آزاد خارجہ پالیسی بنانے کی ضرورت ہے۔ براہِ کرم دہشت گردی کے خلاف جنگ کے جواز اور طریقۂ کار پر نظر ثانی اور سیکورٹی کی پالیسی پر غور و فکر کریں۔ ان تینوں امور کو اس مشترکہ قرارداد میں نشان زد کیا گیا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ قوت اور طاقت کا استعمال مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ فوجی حل نہیں سیاسی حل کے ذریعہ مسائل حل کرنے ہوں گے۔ ہم نے ان حوالوں سے کوئی پیش رفت نہیں کی ہے۔ اس کے برعکس کیا ہو رہا ہے کہ امریکہ کے دباؤ میں، ہماری خارجہ پالیسی، ہماری داخلہ پالیسی،

نچلی اور اوپری سطح پر انتظامیہ عالمی بینک اور آئی ایم ایف کی ایک نئی غلامی میں جکڑی گئی ہے جسے ہم نے قبول بھی کر لیا ہے۔

آپ تزویراتی مکالمے کی بات کر رہے ہیں۔ امریکی اخبارات کا مطالعہ کیجیے وہ کہتے ہیں کہ امریکی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ دو ممالک کے درمیان اس قسم کا تزویراتی مکالمہ دفتر خارجہ میں ہوا ہے۔ نہ پنٹاگون میں اور نہ ہی کیپٹل ہل میں بلکہ وہ امریکی جوائنٹ چیف آف اسٹاف ایڈمرل مولن کے گھر پر ہوا ہے۔ آپ سر جوڑتے ہیں وہ آپ کا سر توڑنے کی بات کرتے ہیں۔ اسی دوران امریکی وزیرِ خارجہ ہلیری کلنٹن (Hillary Clinton) کا جو بیان فیصل شہزاد نامی شخص کے بارے میں آیا ہے[1] وہ آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے کہ کس طرح ہمیں ملوث کیا جا رہا ہے۔ اس بیان کے تین دن کے بعد سینیٹ کی سٹینڈنگ کمیٹی کے سینیٹرز نے کہا ہے کہ ہمیں جو خفیہ بریفنگ دی گئی ہے اس میں کوئی چیز ایسی نہیں آئی جس میں پاکستان کا تعلق فیصل شہزاد سے ثابت ہو۔

جنابِ والا! فیصل شہزاد کے بارے میں جو باتیں امریکی اخبارات میں آ رہی ہیں وہ چشم کشا ہیں۔ بتایا جا رہا ہے کہ اس کا کوئی تعلق کبھی کسی جہادی گروپ سے نہیں رہا۔ وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے، امریکہ کے تعلیم یافتہ خاندان کا فرد اور امریکی شہری ہے اور اس سے زیادہ جو چیز سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ جب اس کو گرفتار کرنے کے لیے جہاز پر اہلکار آتے ہیں تو اس نے کہا کہ مجھے اس گرفتاری کی توقع تھی۔ چاہے آپ ایف آئی اے یا انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ

---

[1] یکم مئی ۲۰۱۰ کو ٹائمز اسکوائر نیویارک میں کار بم تنصیب کرنے کی کوشش میں پکڑے جانے والے ملزم کے حوالے سے امریکی وزیرِ خارجہ ہلیری کلنٹن نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ یہ بم ایک امریکی شہری فیصل شہزاد نے پلانٹ کیا تھا اور مبینہ طور پر اس نے تفتیش کاروں کو بتایا کہ اس نے دہشت گردی کی تربیت شمالی وزیرستان میں حاصل کی تھی۔ شہزاد کا تعلق پاکستان سے ہے جبکہ امریکی جنرل ڈیوڈ پیٹریاس جو افغانستان میں جنگی سرگرمیوں کی نگرانی کر رہے ہیں نے کہا ہے کہ شہزاد کسی بھی دوسرے گروپ کے ساتھ کام نہیں کر رہا۔ وہ 'تنہا بھیڑیا' ہے، امریکی وزیرِ خارجہ ہیلری کلنٹن نے کہا کہ اگر ہم ٹائم اسکوائر کار بم کا تعلق پاکستان سے تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے تو اس کے بڑے خطرناک نتائج ہونگے۔

سے پتہ کریں یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے۔ گویا یہ تمام ملی بھگت ہے۔ آپ دیکھیں کہ عجیب و غریب واقعہ ہے کہ ایسی جگہ پر جہاں پارکنگ نہیں ہو سکتی وہاں گاڑی پارک کی جاتی ہے۔ گاڑی کے اندر جو کھاد رکھی جا رہی ہے وہ شوگر کی کھاد ہے جبکہ بم کے لیے امونیا کھاد استعمال ہوتی ہے جو وہاں پر ہے ہی نہیں۔ وہاں پر وہ چابی چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور یہ ایسی چابی ہے جس پر اس کے گھر کا پتا بھی لکھا ہوا ہے۔ درحقیقت جب تک آپ اپنی خارجہ پالیسی کو تبدیل نہیں کرتے آپ اس ملک کی آزادی اور اس کی عزت کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ جنابِ والا! مذکورہ وجوہات کی بنا پر میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ صدر کا خطاب مایوس کن ہے، حکومت کی کارکردگی مایوس کن ہے۔ آپ کو جو مہلت ملی وہ ختم ہو رہی ہے اور اگر آپ نے اب بھی ہوش کے ناخن نہیں لیے اور اپنی پالیسیوں میں بنیادی تبدیلیاں نہیں کیں تو مجھے ڈر ہے کہ یہ قوم ہرگز آپ کے اقتدار کے ساتھ نہیں چلے گی۔ (۱۴ مئی ۲۰۱۰ء)

آغازِ حقوقِ بلوچستان پیکیج

وفاقی حکومت نے آغازِ حقوقِ بلوچستان پیکیج پیش کیا جس میں سیاسی، انتظامی اور معاشی اقدامات شامل تھے۔ یہ پیکیج سینیٹ کے چیئرمین میاں رضا ربانی کی سربراہی میں ایک پارلیمانی کمیٹی نے تیار کیا اس کی تیاری میں تمام جماعتوں کی قیادت شامل تھی۔ اس پیکیج میں مندرجہ ذیل اہم اقدامات کا اعلان کیا گیا۔

۱۔ تمام سیاسی کارکنوں کو رہا کر دیا جائے گا اور جو جلاوطن ہیں ان کو واپس لایا جائے گا۔ وفاقی حکومت بلوچستان حکومت کے مشورے سے سیاسی کارکنوں کو رہا کرے گی سوائے ان لوگوں کے جو گھناؤنے جرائم میں ملوث ہیں۔ سیاسی مذاکرات شروع کیے جائیں گے اور لاپتہ افراد کے سلسلے میں سپریم کورٹ کے جج کی سربراہی میں ایک کمیشن قائم کیا جائے گا جو لوگ لاپتہ ہیں ان کے نام مشتہر کیے جائیں گے اور جن کے خلاف کوئی الزامات نہیں ہیں انہیں رہا کر دیا جائے گا۔ جن کے خلاف الزامات ہیں سات دن کے اندر متعلقہ عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ لاپتہ افراد کے خاندان کے افراد کو ان کے بارے میں معلومات فراہم کی جائے گی اور ان کو ملاقات کا حق دیا جائے گا۔ اور عوام کے حقوق بحال کیے جائیں گے، لوگوں کے خلاف کوئی آپریشن نہیں کیا جائے گا۔

۲۔ بلوچستان جیسا کہ تیل گیس، سونا، تانبا، گندھک اور دیگر معدنی وسائل سے مالا مال صوبہ ہے لیکن سب سے زیادہ پسماندہ ہے اس لیے بلوچستان کے مالی وسائل پر اس کو مالکانہ حقوق دینے کی ضرورت ہے۔

۳۔ صوبائی خود مختاری کو مستحکم کرنے کے لیے ضروری آئینی ترمیم کی جائے گی جس میں قانون سازی کی مشترکہ فہرست، پولیس آرڈر اور چھٹے شیڈول سے بلوچستان لوکل گورنمنٹ آرڈیننس ۲۰۰۱ء کا خاتمہ کیا جائے گا اور مشترکہ مفادات کونسل سے متعلق آئین کے آرٹیکل ۱۵۳ پر مؤثر عملدرآمد کیا جائے گا۔ آغازِ حقوقِ بلوچستان پیکیج کے تحت آئین کے آرٹیکل ۱۵۴ سے ۱۵۹ اور ۱۷۰ پر مؤثر عملدرآمد کیا جائے گا۔

۴۔ قومی مالیاتی کمیشن کا ڈھانچہ دوبارہ تشکیل دیا جائے گا اور نئے معیار کے مطابق آبادی کا تناسب، غربت اور وسائل کی پیداوار کو بنیاد بنایا جائے گا۔

۵۔ بلوچستان اسمبلی کی ۲۰۰۲ء سے اب تک صوبے سے متعلق متفقہ طور پر منظور کی گئی قرار دادوں کو آئین کے قانونی ڈھانچہ کی روشنی میں صوبے میں نافذ کیا جائے گا۔ وفاقی حکومت صوبے میں وفاقی ایجنسیوں کے کردار پر نظر ثانی کرے گی اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کے علاوہ صوبے میں جاری تمام آپریشنز روک دیے جائیں گے۔ وفاقی حکومت نے اعلان کیا ہے کہ سوئی کے علاقے سے موجود فوج کو ہٹالیا جائے گا اور اس کی جگہ فرنٹیئر کانسٹیبلری کو تعینات کیا جائے گا۔ تمام شہری علاقوں میں عمومی طور پر پولیس ہوگی۔ قانون کے نفاذ کے لیے فرنٹیئر کانسٹیبلری وزیر اعلیٰ کے ماتحت کام کرے گی۔ کسٹم ایکٹ کے تحت ایف سی کو جو اختیارات دیے گئے ہیں وہ واپس لے لیے جائیں گے۔ کوسٹ گارڈ سرحدوں اور ساحلی علاقوں میں اسلحہ اور منشیات کی سمگلنگ روکنے کی بنیادی ڈیوٹی کرے گی۔ [سیکورٹی چیک پوسٹیں] سرحدی علاقوں کے علاوہ دیگر علاقوں میں صوبائی حکومت کی ہدایت پر قائم ہوں گی۔

۶۔ سرحدی علاقوں کے علاوہ صوبے میں نئے کنٹونمنٹ کی تعمیر نہیں کی جائے گی۔ سوئی اور کوہلو کے علاقے میں کنٹونمنٹ کی تعمیر فی الوقت روک دی جائے گی۔

۷۔ نواب اکبر بگٹی کے قتل کی وجوہات جاننے کے لیے ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ جج پر مشتمل کمیشن قائم کیا جائے گا۔ اعلیٰ عدالتی حکم کے ذریعے بلوچ سیاسی کارکنوں کے قتل اور ٹارگٹ کلنگ کی عدالتی تحقیقات کروائی جائیں گی۔ ڈیرہ بگٹی کے بے گھر ہونے والے افراد کے لیے وفاقی حکومت ایک ارب روپے ادا کرے گی۔

۸۔ گوادر کی زمین کی الاٹمنٹ کی اعلیٰ عدالتی تحقیقات کروائی جائے گی۔ صوبے میں تمام بڑے منصوبے صوبائی حکومت کی رضا مندی سے شروع کیے جائیں گے۔ ان منصوبوں کے معاہدوں میں صوبے کے منافع اور مفادات کو یقینی بنایا جائے گا۔ گوادر میں گریڈ ایک سے لیکر ۱۶ تک تمام ملازمتیں مقامی آبادی کو دی جائیں گی اور اسی طرح مقامی ٹھیکیداروں کو ٹھیکے دینے میں ترجیح دی جائے گی۔ گوادر کی بندر گاہ کی وجہ سے جو ماہی گیر متاثر ہوئے ہیں انھیں معاوضہ دیا جائے گا۔ ماہری گیروں کے لیے پورٹ کی مغربی اور مشرقی جانب دو برتھیں تعمیر کی جائیں گی۔ گوادر پورٹ سے ہونے والی آمدنی کا ایک حصہ صوبے کی ترقی پر خرچ کیا جائے گا۔ وزیر اعلیٰ گوادر پورٹ کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کا چیئرمین ہوگا اور وہ پورٹ اتھارٹی کا چیئرمین نامزد کرے گا۔

۹۔ صوبے کے زیرِ زمین وسائل کے سلسلہ میں متعلقہ قبائل کو رائلٹی کی ادائیگی کو مناسب انداز میں طے کیا جائے گا صوبائی حکومت اس ضلع کو جہاں قدرتی وسائل نکلے ہیں ۱۵ فیصد رائلٹی دے گی۔ وفاقی حکومت ۱۹۵۴ء سے لے کر ۱۹۹۱ء تک گیس ڈویلپمنٹ سرچارج پر ایک سو بیس ارب روپے رائلٹی اگلے بارہ سال میں ادا کرے گی۔ قدرتی وسائل بازیاب ہونے پر وفاقی حکومت منافع کا دس فیصد علاقے کی ترقی پر خرچ کرے گی۔

۱۰۔ سوئی کے علاقے کے لیے خصوصی ترقی کے لیے پیکیج دیا جائے گا۔ پاکستان پٹرولیم آئل اینڈ گیس اور سوئی سدرن گیس کے اوپن مارکیٹ سے بیس فیصد حقوق بلوچستان حکومت خریدے گی جبکہ وفاقی حکومت سینڈیک منصوبے سے اپنے تیس فیصد حصص میں سے بیس فیصد حصص صوبے کو منتقل کرے گی اور منافع میں صوبائی حکومت کی شراکت کے حوالے سے معاہدوں پر نظر ثانی ہو گی۔

۱۱۔ پورے ملک میں گیس کی یکساں قیمت مقرر کی جائے گی۔ کوہلو کے علاقے میں تیل اور گیس کی تلاش میں مدد کرنے کے بدلے مقامی قبائل کو خصوصی ترغیبات دی جائیں گی۔

۱۲۔ ایچ ای سی کی سکالرشپ: اندرون و بیرون ملک پی ایچ ڈی کے لیے سکالرشپ کے لیے بلوچستان کا خصوصی کوٹہ مقرر کیا جائے گا۔

۱۳۔ بلوچستان پیکیج پر عملدرآمد کی نگرانی کے لیے ایک طریقۂ کار متعین کیا جائے گا۔

۱۴۔ سیلاب متاثرین کی جو امدادی رقوم وفاقی حکومت نے ابھی تک نہیں دی ہیں ان کی ادائیگی کی جائے گی۔

۱۵۔ وفاقی حکومت بلوچستان کے کوٹے پر سختی سے عمل کرائے گی اور پانچ ہزار اضافی آسامیاں مہیا کرے گی۔ کوسٹ گارڈ میں مقامی لوگوں کو ملازمت دی جائے گی۔

۱۶۔ صوبے میں بالخصوص کوئٹہ، پشین، قلعہ عبداللہ، قلعہ سیف اللہ اور ژوب میں چھوٹے ڈیم تعمیر کیے جائیں گے۔

۱۷۔ وفاقی، صوبائی حکومتیں اور تمام محکمے ان تجاویز پر عمل درآمد کی رپورٹ پارلیمنٹ کی نیشنل سیکورٹی کمیٹی کو دیں گے۔ آغازِ حقوقِ بلوچستان پیکیج پر عملدرآمد پر وفاقی اور صوبائی حکومتیں ہر تین ماہ بعد ایک رپورٹ پارلیمنٹ میں پیش کریں گی۔ بین الصوبائی رابطہ کا وزیر ہر سال کے آخر میں اس پیکیج کے حوالے سے خرچ کی گئی رقم کی تصدیق کرے گا۔

باب نمبر ۷

اچھی حکمرانی کا فقدان

- ۲ -

[آصف علی زرداری کے خطاب پر تبصرہ (۲۰۱۱ء)]

۲۳ مارچ ۲۰۱۱ء کو صدر آصف علی زرداری نے پارلیمنٹ سے اپنے تیسرے سالانہ خطاب میں گذشتہ عرصہ میں جہاں حکومتی کارکردگی پر روشنی ڈالی وہیں مستقبل میں پاکستان کے معاشی مسائل کے حل کے ضمن میں حزبِ اختلاف کو میثاقِ معیشت کے لیے نیشنل ڈائیلاگ کی دعوت دی۔ انھوں نے خیال ظاہر کیا کہ پاکستان کو توانائی کے بحران، گردشی قرضوں، ٹیکس کے نظام میں کمزوریوں، سرکاری اداروں کے ڈھانچے کی تدوین نو اور معیشت کی دستاویز بندی جیسے مسائل کا سامنا ہے جنہیں مل کر حل کرنا ہوگا۔

انہوں نے جہاں اندرون ملک انتہا پسندی سے نمٹنے کے عزم کا اعادہ کیا وہیں بھارت اور افغانستان کو یقین دلایا کہ پاکستان کی سرزمین ان کے خلاف کسی بھی قسم کی دہشت گردی کے لیے استعمال نہیں ہوگی۔ اندرون ملک امن و امان کی بحالی اور تشدد کے خاتمے کے لیے انہوں نے تمام وسائل استعمال کرنے کا عزم کا اظہار کیا۔ صدر کے اس خطاب کے دوران حزبِ اختلاف نے اجلاس کا بائیکاٹ کیا تاہم آئینی طریقۂ کار اور روایت کے مطابق صدرِ مملکت کے پارلیمنٹ سے سالانہ خطاب کی تکمیل اراکین پارلیمنٹ کی تبصروں، تنقید اور تجاویز سے ہوئی۔

پروفیسر خورشید احمد کی زیر نظر تقریر صدر کے اسی خطاب پر تبصرہ سے متعلق ہے۔

جناب چیئرمین! میں اپنی بات کا آغاز اس بات سے کروں گا کہ صدر صاحب کا یہ

خطاب پارلیمنٹ میں ایک بڑے بدلے ہوئے ماحول میں ہوا ہے اور اسے ریکارڈ پر لانا بہت ضروری ہے۔ اس سے پہلے سالوں میں ان کے جو بھی خطابات تھے، اختلاف و اتفاق اپنی جگہ پر لیکن پارلیمنٹ نے بحیثیت مجموعی احترام کے ساتھ ان کی بات کو سنا۔ البتہ اس موقع پر ماحول بالکل برعکس تھا۔ حکومت اور اس کے صرف دو اتحادیوں کو چھوڑ کر باقی تمام جماعتوں نے اس خطاب کے دوران اجلاس کا بائیکاٹ کیا اور سوا چار سو کے ایوان میں دو سو سے زیادہ افراد ایوان سے باہر چلے گئے۔ یہ بات بہر حال واضح رہنا چاہیے کہ اپوزیشن کی جانب سے احتجاج ریکارڈ کرانا ہمارا حق ہے اور اس کے لیے ہم نے کوئی ایسی چیز نہیں کی جو پارلیمانی آداب کے خلاف ہو۔ صدر کے خطاب پر بحث کے پس منظر میں اس بات کو مد نظر رکھنا چاہیے کہ یہ تقریر ایک مختلف ماحول میں ہوئی ہے۔

دوسری بات میں آپ کو یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے جناب صدر کے اس سے پہلے کے تمام خطابات پر ایک بار پھر نظر ڈالی ہے۔ میں دکھ سے یہ بات کہتا ہوں کہ اپنے مواد کے اعتبار سے، یہ سب سے زیادہ مفلس خطاب تھا۔ سوچ اور مواد دونوں اعتبار سے شدید کمی مجھے اس میں ہر صفحے پر نظر آئی جو ہمارے لیے نہایت تکلیف دہ ہے۔ صدر کا خطاب ایک علامتی چیز ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ سال میں ایک بار پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں صدر صاحب اس وقت کے اہم مسائل و معاملات کو نمایاں کریں اور پھر اس سے آگے بڑھ کر یہ بیان کیا جائے کہ آنے والے سال کے بارے میں حکومت کی پالیسیاں کیا ہوں گی اور کیا قانون سازی کرائی جائے گی۔ صدر کے خطاب کے معنی صدر کی ذاتی رائے کا اظہار نہیں بلکہ حکومت کا اظہار ہوتا ہے اور اسی لیے حکومت ہی اس تقریر کو تیار کرتی ہے۔ اس خطاب کو ان تمام پہلوؤں سے میں نے بہت ہی کمزور پایا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ عوام کے بنیادی مسائل کا اس میں کوئی ذکر موجود نہیں ہے۔ نہ ہی یہ ذکر ہے کہ کیا قانون سازی کی جانی ہے۔

قومی معاملات میں بیرونی مداخلت: خارجہ پالیسی اور خارجہ پالیسی میں بھی سب سے اہم مسئلہ جس نے اس پورے زمانے میں پوری قوم کو ہلا کر رکھ دیا ہے وہ ہمارے معاملات میں امریکی

مداخلت ہے۔ دہشت گردی کے خلاف نام نہاد امریکی جنگ کے نتائج پر ابھی Pew کا پاکستانی رائے عامہ کے جائزہ پر مبنی سروے آیا ہے جو پاکستانی عوام کے جذبات کو سمجھنے کے لیے اہم راہنمائی فراہم کرتا ہے۔ یہ واضح رہنا بھی ضروری ہے کہ یہ واحد سروے نہیں ہے بلکہ جتنے بھی سروے ہوئے ان میں آپ مسلسل ایک ہی رجحان دیکھیں گے کہ تقریباً نوے فیصد پاکستانی دہشت گردی کے خلاف امریکہ کی جنگ کو اپنی جنگ نہیں سمجھتے۔ وہ اسے نقصان دہ سمجھتے ہیں اور امریکہ اور بھارت کو پاکستان کا سب سے اہم دشمن قرار دیتے ہیں۔ واضح رہے کہ سروے میں لفظ دشمن استعمال ہوا ہے۔ آپ عوام کی نمائندگی کی بات کرتے ہیں لیکن عوام کے جذبات کی کوئی عکاسی نہ آپ کی پالیسی میں ہے نہ ہی صدر کے اس پالیسی بیان میں نظر آتی ہے۔

اس کے ساتھ میں یہ بھی کہوں گا کہ پارلیمنٹ نے دو مواقع، ۲۲ اکتوبر ۲۰۰۸ء اور ۱۴ مئی ۲۰۱۱ء، کو بہت صاف الفاظ میں امریکی قیادت میں لڑی جانے والی اس جنگ اور امریکہ سے تعلقات کے بارے میں اور اسی طرح ڈرون حملوں اور امریکی ایجنسیوں کی مداخلت کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر صاف اور واضح الفاظ میں دے دیا ہے۔ لیکن اس خطاب میں ان امور کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ حتّٰی کہ ڈرون حملے اور ریمنڈ ڈیوس کا جو معاملہ تھا[1]، اس کا ذکر تک نہیں ہے۔ اسی لیے میں نے کہا ہے کہ مواد کی شدید کمی کے اعتبار سے اس سے زیادہ کمزور تقریر کسی بھی صدر کی، بشمول ان کے، نہیں دیکھی۔ ان کی پچھلی دو تقاریر نسبتاً بہتر تھیں لیکن یہ موجودہ تقریر بڑی مایوس کن ہے۔

جنابِ والا! میں آپ سے یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ صدر صاحب نے جس پسِ منظر میں قوم سے خطاب کیا ہے اس میں یہ بات سامنے رکھنی چاہیے تھی کہ عوامی

---

[1] ۲۶ جنوری ۲۰۱۱ء کو امریکی بلیک واٹر تنظیم کے اہل کار ریمنڈ ڈیوس نے لاہور میں دو پاکستانیوں کو فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا تھا۔

جائزوں کے مطابق پیپلز پارٹی کی عوامی حمایت ۲۰ اور ۲۲ فیصدی کے لگ بھگ ہے، جو بہت کم ہے۔ اس میں صدر صاحب کی ریٹنگ اور بھی کم ہو کر صرف گیارہ فیصد ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ صرف بارہ فیصد نے کہا ہے کہ امریکہ کی پالیسیاں ٹھیک ہیں اور گیارہ فیصد نے کہا ہے ہم تائید کرتے ہیں اور ہم زرداری صاحب پر اعتماد کرتے ہیں۔ اتنے کم درجے پر یہ بات کی گئی ہے لہٰذا اس کو میں ریکارڈ پر لانا ضروری سمجھتا ہوں۔

عہدۂ صدارت کی بے توقیری: اگلی بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں، جو میری نگاہ میں بے حد اہم ہے، کہ جناب آصف علی زرداری صاحب صدارت کے عہدے کی مسلسل بے توقیری کر رہے ہیں۔ مسئلہ کسی ایک شخص کی ذات کا نہیں بلکہ ادارے اور قانون کا ہے۔ ہم شروع سے یہ بات کہہ رہے ہیں کہ جب وہ صدر منتخب ہو گئے تو اس کے بعد انہیں وفاق کی علامت ہونا چاہیے۔

میں نے ذاتی طور پر ان کو ووٹ نہیں دیا تھا لیکن جب وہ منتخب ہو گئے تو ذاتی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی ہم نے ان کو مبارکباد بھی دی اور تعاون کا یقین بھی دلایا۔ جیسے میں نے عرض کیا جس معاملے میں بھی ہم نے ان کی اور حکومت کی رائے کو درست سمجھا ہے ہم نے اس کی تائید کی ہے۔ محض اپوزیشن برائے اپوزیشن نہیں کی۔ لیکن مجھے یہ دیکھتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ انہوں نے سیاسی عہدہ، یعنی اپنی پارٹی کی سربراہی، ساتھ رکھ کر ایوانِ صدر کو بھی بے توقیر کیا ہے اور صدارت کے عہدے کا بھی غلط استعمال کیا ہے اور مسلسل کر رہے ہیں۔ حتّٰی کہ لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے[1] کے بعد ایوانِ صدر کے کھلے استعمال میں بھی شاید ہی کچھ فرق پڑا ہو۔ جو تقاریر وہ کر رہے ہیں اس میں بہر حال کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ ہم سمجھنے سے قاصر ہیں کہ وہ کس موقع پر صدر کی حیثیت سے بول رہے ہیں اور کب پارٹی سربراہ کی حیثیت سے یا سندھ کے کسی خاص مقام کے ایک نمائندے کی حیثیت سے بول

---

[1] پاکستان لائرز فورم کی درخواست پر لاہور ہائی کورٹ نے ۱۱ مئی ۲۰۱۱ء کو صدر جناب آصف علی زرداری سے چیئرمین پی پی پی اور صدر پاکستان کے عہدوں میں سے کسی ایک سے علیحدہ ہونے کے لیے کہا تھا۔

رہے ہیں۔ یہ بڑا نازک مسئلہ ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس کو ریکارڈ پر لاؤں کہ یہ ایوانِ صدر کا ناجائز استعمال ہے۔

بات صرف اتنی ہی نہیں۔ انہوں نے اس تقریر میں احسان جتایا ہے کہ مجھے جو اختیارات حاصل تھے وہ میں نے دے دیئے اور تاریخ میں آج تک کبھی ایسا واقعہ نہیں ہوا۔ مجھے پتا نہیں انہوں نے کون سی تاریخ پڑھی ہے۔ اگر آپ بادشاہت کے خلاف تاریخ کا مطالعہ کریں، جمہوری قوتوں کے ظہور اور ترقی کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ دنیا کے ہر ملک میں اور ہر پلیٹ فارم پر اصحابِ اقتدار کو اپنے اختیارات سے جس کے وہ مستحق نہیں تھے دست کش ہونا پڑا ہے۔ کچھ نے اسے برضا و رغبت قبول کر لیا اور کچھ نے مجبور ہو کر کیا۔ اس سے تاریخ بھری پڑی ہے۔

میں ان کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ جس مینڈیٹ پر ۲۰۰۸ء کے انتخابات ہوئے اس میں سب پارٹیوں نے، بشمول پیپلز پارٹی، اس بات کا واضح اعلان کیا تھا کہ ۱۹۷۳ء کا دستور، جیسا کہ وہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو تھا، چند ترامیم کے ساتھ ہمارا منشور ہے۔ دوسرے الفاظ میں جو توڑ پھوڑ یا تبدیلی دستور میں کی گئی تھی اس کو ٹھیک کرنا ۲۰۰۸ مینڈیٹ کا حصہ تھا۔ چنانچہ ۱۸ویں ترمیم کے نتیجہ میں صدر کے اختیارات میں کمی قبول کر کے کوئی احسان آپ نے ہم پر نہیں کیا ہے بلکہ یہ عوام کا مطالبہ تھا اور درحقیقت آپ نے اس کو پورا کرنے میں تاخیر کی ہے۔ چنانچہ اس سے قبل ۱۸ویں ترمیم کی ہم نے بھی اسی لیے تائید کی۔ اس ضمن میں ایک بار پھر میں میاں رضا ربانی صاحب کو خراجِ تحسین پیش کروں گا جن کی قیادت میں ہم اتفاق رائے کے ساتھ دستوری ترامیم لا سکے۔

جنابِ والا! مجھے کہنے کی اجازت دیجیے کہ ۱۸ویں ترمیم کے قبول کیے جانے کے بعد اس کی سب سے زیادہ خلاف ورزی اگر کسی نے کی ہے تو وہ خود صدرِ مملکت ہیں۔ ایک طرف وہ یہاں پر آ کر احسان جتاتے ہیں کہ میں نے اختیارات منتقل کر دیئے ہیں۔ دوسری طرف یہ سوالیہ نشان ہے کہ کیا عملاً کوئی چیز منتقل ہوئی ہے۔ میں نے ۱۹۴۷ء سے لے کر اب تک کے

تمام ادوار کا موازنہ کیا ہے حتّٰی کہ وہ دور بھی جب صدارتی نظام تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جتنے بیرونی دورے ان صدر صاحب نے کیے ہیں کسی اور نے نہیں کیے۔ کیوں ؟ حالانکہ وہ تو علامت ہیں، پالیسی بنانے والے یا چیف ایگزیکٹو نہیں ہیں۔ یہ ان کا کام نہیں ہے کہ وہ اقتصادی مذاکرات کریں یا فارن پالیسی کا تعین کریں۔ یہ ان کا کام نہیں ہے کہ بیرونی ممالک کی فوج کے سربراہوں سے یا وزرائے خارجہ سے مل کر معاملات طے کریں، یہ ان کا کام نہیں ہے کہ سربراہی اجلاس میں جہاں پر چیف ایگزیکٹو کو ہونا چاہیے وہ جائیں۔ آپ دیکھیں کہ وہ اختیار کا مسلسل غلط استعمال کر رہے ہیں۔ ۱۸ویں ترمیم پارلیمنٹ نے متفقہ طور پر منظور کی ہے اور اس کی منظوری انہوں نے دی ہے لیکن اس پر وہ عمل نہیں کر رہے۔ یہ ایک بہت بڑا سقم ہے، یہ دستور کی خلاف ورزی ہے اور مینڈیٹ کی خلاف ورزی ہے۔ اس کے بعد بھی اگر وہ احسان جتاتے ہیں تو میں اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں ع

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

طرزِ حکمرانی پر عوامی اضطراب: جنابِ والا! میرا اگلا نکتہ حکمرانی کے متعلق ہے۔ مجھے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ جتنی خراب حکمرانی ان تین سالوں میں اس حکومت نے کی ہے اس سے پہلے بُرے سے بُرے دور میں بھی حالات اس سے بہتر تھے۔ مزید دکھ اس بات کا ہوتا ہے کہ ہر طرف سے لوگ پکار رہے ہیں اس کے باجود کہ اس کا کسی کو کوئی احساس نہیں ہے۔ ابھی Pew کے جس سروے کا میں نے ذکر کیا اس کا اہم پہلو یہ ہے کہ جب لوگوں سے پوچھا گیا کہ کیا ان کے خیال میں حکومت کی سمت صحیح ہے تو جواباً ۹۲ فیصد نے کہا کہ غلط ہے۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ کی معاشی حالت بہتر ہوئی ہے یا خراب ہوئی ہے۔ جواباً ۸۵ فیصد نے کہا خراب ہوئی ہے۔ جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ اگلے ایک سال میں ان تجربات کی روشنی میں آپ کا کیا اندازہ ہے کیا ہو گا؟ ۸۰ فیصد نے یہ کہا کہ حالات خراب ہوں گے۔ آپ دیکھیے کہ سپریم کورٹ، کتنے تحمل سے بار بار موقع دے رہی ہے لیکن حکومت کا ایک ہی رویہ ہے میں نہ مانوں۔ میں نہ مانوں۔ بالآخر جب مجبور ہوتے ہیں تو وہی جوتے اور پیاز والا معاملہ ہو جاتا ہے۔

جنابِ والا! حکمرانی جتنی خراب اس وقت ہے اس کا اظہار کرتے ہوئے بھی دکھ ہوتا ہے۔ میں کہوں گا کہ اس کے خطرات پاکستان کے وجود کے خطرات کے مقام تک پہنچ رہے ہیں۔ خدا کے لیے ہوش کے ناخن لیجیے۔

قیادت کا دوغلا پن: جنابِ والا! اس کے بعد یہ کہنے کی بھی جسارت کروں گا کہ صدر صاحب کا رویہ بہت غیر محتاط ہے۔ خاص طور پر ان تقاریر میں بے احتیاطی بہت نمایاں ہے جو مختلف برسیوں اور سالگرہ کے مواقع پر ہوئی ہیں۔ ان مواقع پر ان کی زبان، ان کا انداز اور ان کی تقاریر کا مواد شدید قابلِ اعتراض ہے۔ ان تقاریر میں دوسروں کے لیے تحقیر اور تذلیل کا راستہ اختیار کیا گیا ہے۔ یہ تمام چیزیں وہ ہیں جس کا اس حکومت کو جواب دینا ہے۔ ہمارے لیے افسوس کا مقام ہے اور میں واضح طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ اس سے پارلیمنٹ کی اور ملک کی عزت بڑھ نہیں رہی کم ہو رہی ہے۔ اس ضمن میں وکی لیکس کا حوالہ دیتے ہوئے مجھے دکھ ہوتا ہے اور اس سے ہمارے سر شرم سے جھک جاتے ہیں۔ دوغلی باتیں عوام کے سامنے کچھ کہنا اور غیر ملکی سفارتکاروں سے کچھ اور بات کہنا۔ یہ کہنا کہ تم حملے کیے جاؤ ہم احتجاج کرتے رہیں گے نہ عوام میں ہمارا اعتبار باقی رکھ سکتا ہے اور نہ ہی بیرونی دنیا میں۔ اس کے بعد جو کیفیت نظر آتی ہے وہ غیر فطری نہیں کہ آپ اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے بیرونی قوتوں پر انحصار کرتے ہیں۔

یہی انحصار ہے کہ آپ اپنے عوام اور اپنے اداروں پر اعتماد کی بجائے بیرونی قوتوں سے اقتدار کی بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔ یہ کیا صورتحال ہے اور اس کا نتیجہ کیا ہے۔ ابھی وکی لیکس کے جو تازہ انکشافات آئے ہیں، ان میں برطانوی چیف آف اسٹاف اور برطانوی سفراء نے امریکی سفیر سے ہمارے صدر کے بارے میں جو الفاظ کہے ہیں میں ان کو دہرانے میں بھی تکلیف محسوس کرتا ہوں[1]۔ اخبارات میں وہ آچکے ہیں کہ انہوں نے کن الفاظ میں ان کا ذکر کیا ہے۔ جنابِ والا! یہ پاکستان کی عزت کا مسئلہ ہے۔

---

[1] دیکھیے: "Pakistan's Zardari is a 'numbskull'." گارڈین، ۳۰ نومبر ۲۰۱۰ء

معیشت کا انتظام اور عوام کے مسائل: اگلا نکتہ جنابِ والا! خطرناک حدوں کو چھوتا ہوا افراطِ زر ہے۔ رائے عامہ کے جائزہ میں جو مسئلہ سرفہرست آیا ہے وہ افراطِ زر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ افراطِ زر جتنا اس دور میں بڑھا وہ خطرناک حدوں کو چھو رہا ہے۔ اگر آپ ملک کی معاشی ترقی کا جائزہ لیں تو ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء میں ہماری ترقی کی اوسط شرح ۶ فیصد سے ۷ فیصد تھی۔ ۷۰، ۸۰ اور ۹۰ کی دہائی میں یہ ۵ فیصد اور ۶ فیصد کے درمیان تھی۔ لیکن گذشتہ چار سالوں میں یہ محض ۲٫۴ فیصد رہی اور اس میں بھی اعداد و شمار کو بگاڑ کر تماشہ کیا گیا ہے۔ ترقی کی حقیقی شرح بمشکل ایک فیصد ہے۔ دوسری طرف افراطِ زر کا کیا حال ہے۔ صرف ان ساڑھے تین سالوں میں اوسط افراطِ زر ۶۰ فیصد سے زیادہ ہوا ہے۔ خوراک کی قیمتوں میں اضافہ اور بھی زیادہ یعنی ۹۰ فیصد ہوا۔ بجلی کی قیمتیں ۷۰ فیصد بڑھی ہیں۔

دوسری جانب تنخواہوں اور آمدنی کی کیا کیفیت ہے؟ اس ضمن میں خاص طور پر عالمی بینک کی رپورٹ یہ کہتی ہے کہ پچھلے تین سالوں میں آبادی کے مزید تقریباً ڈھائی کروڑ افراد غربت کی لکیر کے نیچے چلے گئے ہیں۔ یہ ہے معیشت کا حال اور افراطِ زر کا حال۔ اسی طرح بے روزگاری اور کرپشن کے مسائل ہیں لیکن ان کی طرف کوئی توجہ نہیں ہے۔ سپریم کورٹ کی روزانہ کی کارروائی پڑھ کر انسان سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے کہ سپریم کورٹ ملک کو چلا رہی ہے۔ کرپٹ لوگوں کو بڑھاوا دیا جا رہا ہے۔ دوستوں کو اہم مقامات پر لایا جا رہا ہے۔ جو لوگ اچھا کام کرتے ہیں انہیں ہٹایا جاتا ہے۔ اربوں کے اسکینڈل ہر شعبے میں ہو رہے ہیں۔ حتّٰی کہ وزرا کے اکاؤنٹس میں کروڑوں روپیہ آتا ہے اور واپس کیا جاتا ہے لیکن وزیر وہیں کے وہیں رہتے ہیں۔

جنابِ والا! میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ عوامی مسائل پر حکمرانی کا نہ ہونا، بری حکمرانی اور اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا ہیں، پاکستان غریب ملک نہیں۔ وسائل ہمارے پاس ہیں لیکن ان وسائل کا غلط استعمال اور کرپشن، ذاتی مفادات کے لیے استعمال کرنا اور پالیسی کا فقدان اصل مسائل ہیں۔

قومی آزادی و خود مختاری: جنابِ والا! اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہو گا کہ جس طرح ہم نے اپنی

حاکمیت اور آزادی پر سمجھوتہ کیا ہے وہ نہایت شرمناک ہے اور بے حد خطرناک ہے۔ امریکہ باریک بینی سے اپنا کام انجام دے رہا ہے اور ایک ایک چیز پر اپنے حق میں معاملہ کر رہا ہے۔ کل کے ہی بیانات دیکھیں۔ اوباما صاحب کہتے ہیں کہ محفوظ پناہ گاہوں کو برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون ہوتے ہیں پاکستان کے بارے میں یہ بات کرنے والے۔ کسی کو بھی برداشت کریں یا نہ کریں یہ ہمارا مسئلہ ہے۔ رہا مسئلہ دہشت گردوں کی پناہ گاہوں کے لیے تو میں کہنا چاہتا ہوں کہ دہشت گردوں کی سب سے بڑی پناہ گاہ امریکہ ہے۔ میں یہ بات اپنے الفاظ میں نہیں کہہ رہا۔ اس حوالہ سے ۱۹۸۴ء کا بین الاقوامی عدالت انصاف ہیگ کا فیصلہ موجود ہے جس میں انہوں نے یہ بات کہی کہ کیوبا، نکاراگوا اور لاطینی امریکہ کے کئی ممالک میں دہشت گردی ہو رہی ہے اور وہ سب امریکہ سے ہو رہی ہے۔ معلوم افراد ہیں جن کی سی آئی اے مدد کر رہی ہے۔ کل ہی سی آئی اے چیف کا یہ بیان آیا ہے کہ دنیا کے بہت سے ممالک بشمول پاکستان میں ہم اپنے خفیہ آپریشنز کر رہے ہیں۔

دہشت گردوں کو پناہ دینے والا امریکہ ہے۔ جب تک امریکہ کی پالیسیاں اور اس کا دوغلا پن نہیں بدلتا، جب تک فلسطین اور کشمیر اور ان جیسے دوسرے مسائل انصاف و حق کے مطابق طے نہیں ہوتے، جب تک دنیا کے وسائل جن کو بڑی طاقتیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہی ہیں اصل حقداروں کو نہیں ملتے، دہشت گردی ختم نہیں ہو سکتی۔ دہشت گردی کی اصل وجہ امریکہ ہے، ہم نہیں ہیں۔

کہا جا رہا ہے کہ جنگ کا ناٹک اب افغانستان سے پاکستان آ رہا ہے۔ جنابِ والا! یہ بہت اہم انتباہ ہے۔ اوباما، ہلیری کلنٹن اور رابرٹ گیٹس تینوں کی تقاریر کا آپ موازنہ کر لیجیے۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ امریکہ نے یہ طے کر لیا ہے کہ اب پاکستان کو ہدف بنانا ہے۔ ہمیں دھمکیاں دی جا رہی ہیں کہ حکم مانو ورنہ امداد روک دیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ امداد نہ دیں۔ یہ ہم پر احسان ہو گا۔ اس دہشت گردی کے خلاف جنگ میں حکومت کے اندازے کے مطابق ۶۹ بلین ڈالر کا اب تک نقصان ہو چکا ہے۔ ہر سال ساڑھے تین سو ارب روپے کا

نقصان ہمیں ہو رہا ہے اور یہ ہر سال بڑھ رہا ہے۔ خدا کے لیے اس جنگ سے نکلیے اپنے معاملات خود طے کیجیے۔

دہشت گردی کی کوئی حمایت نہیں کرتا لیکن دہشت گردی کو روکنے کا جو طریقہ ہے وہ یہ نہیں ہے جو آپ نے اختیار کیا ہے۔ اگر دس سال کے تجربات سے بھی آپ کی آنکھیں نہیں کھلیں تو آپ کو اور کونسا جھٹکا چاہیے کیا چیز ہے جو آپ کی آنکھیں کھول سکتی ہے۔ میں صاف طور پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ امریکہ کے ساتھ تعلق کار کے بارے میں دوبارہ بات چیت کر کے امریکہ کی غلامی اور امریکی جنگ سے نکلنا وقت کی ضرورت ہے۔ ہم کسی سے بھی نہیں کہتے کہ آپ امریکہ سے لڑیئے۔ یہ غلط بات کہی جاتی ہے۔ امریکہ سے تعلقات کو دوبارہ طے کرنے کے معنی یہ نہیں کہ اس میں تصادم اختیار کیا جائے۔ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ ہم اپنے قومی مفادات کی روشنی میں اپنے معاملات کو صحیح کریں۔ اور یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ نام نہاد تعاون کے نام پر جو مدد آرہی ہے خدا کے لیے اس کو نہ لیجیے۔ یہ امداد نہیں ہے یہ مصیبت ہے اس نے ہماری معیشت کو تباہ کر دیا ہے۔ ہمیں خود انحصاری کی طرف جانا ہے یہی واحد راستہ ہے اور اس کے لیے امریکہ کی غلامی اور محکومی سے نجات ضروری ہے۔

چار بڑے خسارے

جنابِ والا! اس مجموعی تناظر میں اپنی تقریر کے اختتام پر میں اس وقت درپیش چار بڑے خساروں کی جانب متوجہ کرنا چاہوں گا۔

حکومت کا قانونی جواز: سب سے پہلا خسارہ قانونی جواز ہے۔ یہاں اختیار/مینڈیٹ اور منشور کی بات کی جاتی ہے لیکن جنابِ والا! میں پورے ادب سے عرض کروں گا کہ عوام نے اگر پانچ سال کا موقع دیا ہے تو وہ اچھی حکمرانی کے لیے ہے، وہ منشور پر عمل کرنے کے لیے ہے، کرپشن سے نجات دلانے کے لیے ہے، معاشی ترقی کے لیے ہے، وہ معاملات کو درست کرنے کے لیے ہے اور اگر حکومت اس اختیار کی قدم قدم پر خلاف ورزی کر رہی ہے تو پانچ

سال کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ میں پوری ذمے داری کے ساتھ آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ ۱۹۳۵ء سے ۲۰۰۰ء تک برطانیہ میں سات مواقع ایسے آئے ہیں کہ جن میں پارلیمنٹ نے اپنی چار سال کی مدت پوری نہیں کی۔ اس مدت سے پہلے الیکشن ہوا اور عوام کو نیا اختیار دینے کا موقع دیا گیا۔ ہندوستان کا نام ہم بار بار لیتے ہیں۔ Kaul اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ اس میں صاف لکھا ہوا ہے کہ اب تک گیارہ مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ ہندوستان کی پارلیمنٹ دو یا اڑھائی سال کے بعد تحلیل کر دی گئی ہے اور عوام سے نیا اختیار لیا گیا ہے۔ اس کو تقدس حاصل نہیں۔ اگر آپ اعتماد کھو بیٹھے ہیں، اگر لوگوں میں سے صرف گیارہ فیصد لوگ آپ کو قابلِ اعتماد سمجھ رہے ہیں تو پھر کیا گنجائش ہے کہ ہم قانونی جواز کی بات کریں۔

حکومت کا اعتبار: جنابِ والا! دوسرے نمبر پر اعتبار کا خسارہ ہے۔ ہم کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ نتیجتاً ہماری کسی بات کا اعتبار نہیں ہے۔ وزیرِ داخلہ رحمٰن ملک ہر روز اعلان کرتے ہیں کہ اب کراچی کے معاملات طے ہو گئے ہیں۔ اور کور کمیٹی مل گئی سب کچھ حل ہو گیا ہے۔ اگلے دن کیا ہوتا ہے؟ وہی ٹارگٹ کلنگ ہوتی ہے۔ بلوچستان میں کیا ہو رہا ہے ''آغازِ حقوقِ بلوچستان'' پیکیج کا آپ نے اعلان کیا لیکن عجیب معاملہ ہے کہ اس کا آغاز ہو کے ہی نہیں دیتا، وہیں کا وہیں ہے۔ مسائل روز بڑھ رہے ہیں اور زیادہ گھمبیر ہو رہے ہیں۔ پورے ملک کا یہی حال ہے۔ میں یہ بات صاف کہنا چاہتا ہوں کہ حکومت کا اعتبار باقی نہیں ہے۔ اعتبار قائم رکھنے کے لیے بڑی اہم چیز یہ بھی ہوتی ہے کہ احتساب ہو۔ لیکن اس وقت محاسبہ موجود نہیں ہے۔

صدارتی تقریر میں یہ بات کی گئی ہے کہ ہم ہر سطح پر ہر ایک کا احتساب چاہتے ہیں اور پارلیمنٹ کے سامنے قانون موجود ہے۔ لیکن یہ کہتے ہوئے آپ یہ بات بھول گئے کہ قانون کے اس مسودے کو اڑھائی سال ہو گئے ہیں اور آج تک اسے قانون کا مقام نہیں دیا گیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس میں وہ دفعات جن کی بناء پر فی الحقیقت ہر سطح پر ہر ایک کا احتساب ہو اور وہ غیر جانبدارانہ ہو، اس کے تمام معاملات شفاف ہوں، حکومت خود اس کے لیے تیار نہیں ہے۔ نیب موجود ہے۔ سپریم کورٹ ہر روز انتباہ دے رہی ہے اور ابھی پرسوں ان کو

کہنا پڑا ہے کہ ایک مہینے کے اندر اندر اس کا چیئرمین بناؤ ورنہ نیب ختم ہو جائے گا۔ یہ احتساب کا حال ہے۔ اس لیے میں صاف کہنا چاہتا ہوں کہ قانونی جواز کے ساتھ ساتھ اعتبار نہیں ہے، ایمانداری نہیں ہے۔ ذاتی اور گروہی مفادات کے لیے جس کو لانا چاہتے ہیں اہم پوزیشنوں پر لے آتے ہیں اور اس طرح تمام سروسز کو آلودہ کر دیا ہے۔ کسی کے لیے قابلیت اور صلاحیت بنیاد نہیں ہے۔ پی آئی اے، سٹیل ملز، او جی ڈی سی ایل، غرض کسی بھی ادارے کو دیکھ لیجیے۔ ہر جگہ میرٹ کی بجائے نو آبادیاتی نظام ہے۔ اوپر سے نیچے تک اپنوں کو لانا ہدف ہے۔ یہ تباہی کا راستہ ہے یہ ملک کی تعمیر کا راستہ نہیں ہے۔ اس لیے میں کہنا چاہتا ہوں کہ ایمانداری، اعتبار اور قانونی جواز ہونا چاہیے اور اس کے ساتھ ساتھ تربیت کے ذریعے صلاحیت اور کارکردگی میں بہتری ہونی چاہیے۔

اسراف اور غلط ترجیحات: بجٹ نے اس کو ظاہر کر دیا ہے کہ اپنے چوتھے سال میں بھی حکومت پیداوار میں اضافے اور غریب پرور بجٹ لانے میں مکمل طور پر ناکام رہی ہے۔ اخراجات اور آمدنی کے بارے میں اس کا تجزیہ غلط ہے۔ کل ہی آپ نے دیکھا ہے کہ ۳۸۷ بلین روپے، یعنی پورے بجٹ کا ۲۰ فیصد، انہوں نے اضافی اخراجات کیے ہیں۔ میں صدر صاحب اور وزیر اعظم صاحب کو یاد دلاؤں کہ گزشتہ تقریر میں انہوں نے یہ اعلان کیا تھا کہ اخراجات کو ہم کم کریں گے۔ وزیر اعظم نے تو مقدار بھی دے دی تھی کہ تیس فیصد اخراجات کم کریں گے۔ حقیقت اس کے برعکس یہ ہے کہ تیس فیصد کم نہیں کیے ہیں بلکہ اخراجات ۲۰ فیصد بڑھ گئے ہیں۔ آپ خیال کیجیے کہ صرف صدر اور وزیر اعظم صاحب کے بیرونی دوروں پر ہونے والے کل اخراجات فارن آفس کے بجٹ سے زیادہ ہیں۔ فارن آفس کا سارا بجٹ ایک طرف اور ان دونوں بزرگوں کے بیرونی سفر ایک طرف ہیں۔ یہ آپ کا حال ہے۔ آپ اس ملک کو کہاں لے جا رہے ہیں۔ یہ مکمل ناکامی ہے۔

توانائی کا بحران: توانائی کے معاملہ میں جس نا اہلیت کا مظاہرہ اس حکومت نے کیا ہے وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ صرف آپ بجلی کو لے لیجیے۔ ساڑھے تین سال ہو گئے ہیں لیکن حقیقت

یہ ہے کہ بجلی کا بحران بڑھ رہا ہے، کم نہیں ہو رہا۔ گیس کے بحران کی بھی یہی کیفیت ہے کہ یہ بڑھ رہا ہے، کم نہیں ہو رہا۔ آخر کیوں؟ جو کچھ کیا جا سکتا ہے، وہ نہیں کیا جاتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ تقریباً اٹھارہ انیس ہزار میگاواٹ بجلی کی صلاحیت اس وقت بھی ہمارے پاس موجود ہے لیکن ہماری پیداوار کیا ہے؟ دس ہزار، گیارہ ہزار، بارہ ہزار۔ تقریباً تین ہزار وہ ہے جس کی تنصیبات کو مزید متحرک کر کے اور نقصانات کو کم کر کے ہم بجلی پیدا کر سکتے ہیں لیکن اس کے لیے کوئی اقدامات نہیں ہو رہے۔

توانائی کے زیاں پر سب کو اعتراض ہے۔ دنیا میں توانائی کی ترسیل میں کہیں پانچ سات فیصد کا خسارہ نہیں ہوتا لیکن اس ملک میں تیس اور چونتیس فیصد خسارہ ہے۔ اسے کم کرنے کے لیے جو چیزیں فوری طور پر کی جا سکتی ہیں، انہیں بھی نہیں کیا گیا ہے۔ ان سب کا حاصل کیا ہے؟ ان سب کا حاصل یہ ہے کہ اختیار ختم ہو چکا ہے اور حکمرانی دگرگوں ہے۔ کرپشن ہر طرف موجود ہے۔

جمہوریت بچانے کا راستہ

ان حالات میں اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ جمہوری نظام کو بچانے کے لیے عوام سے رجوع کیا جائے۔ ان سے نیا اختیار لیا جائے اور انہیں موقع دیا جائے کہ وہ اپنی آزاد رائے کے استعمال سے دیانتدار اور باصلاحیت قیادت کو بروئے کار لائیں تاکہ ملک اس دلدل سے نکل سکے۔ یہ ہے جنابِ والا! حالات کا تجزیہ اور اس سے نکلنے کا راستہ۔

(۲۴ جون ۲۰۱۱ء)

پارلیمنٹ اور قانون سازی: قواعد، آداب اور روایات

پارلیمنٹ (سینیٹ آف پاکستان اور قومی اسمبلی) کے بنیادی فرائض میں آئین و قانون سازی اور قواعد وضوابط کی تشکیل شامل ہے۔ اس کے علاوہ مملکت کے مالی معاملات کی منظوری دینا بھی پارلیمنٹ کے بنیادی فرائض میں شامل ہے۔ آئین کے باب دوم میں آرٹیکل ۶۶ اور ۶۷ اور اس سے آگے آرٹیکل ۷۰ تا ۷۷ تک قواعد وضوابط اور قانون سازی سے متعلق تفصیلات دی گئی ہیں۔ پارلیمنٹ کو چلانے کے لیے چیئرمین / اسپیکر، قائدِ ایوان (وزیر اعظم) اور قائدِ حزبِ اختلاف کے عہدے موجود ہیں جن کی آپس کی مشاورت سے پارلیمنٹ میں قانون سازی کا عمل منضبط کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں مملکت کے چند اہم عہدوں پر تقرری کے لیے قائدِ ایوان کو قائدِ حزبِ اختلاف سے بامعنی مشاورت کا پابند کیا گیا ہے۔

سینیٹ کے چیئرمین یا قومی اسمبلی کے اسپیکر کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ ایوان کو آئین، قانون اور قواعد ضوابط کے تحت چلائے۔ ایوان اور اس کے اراکین کے استحقاق کا تحفظ کرے۔ ایوان میں پیش کیے گئے معاملات (توجہ دلاؤ نوٹس / تحریک التواء) پر رولنگ دے اور بطور خاص ایوان کی تکمیل کے لیے ایوان کے اراکین جنھیں حکومت نے بزور اجلاس میں شرکت سے روک رکھا ہو یا کسی اور سبب وہ ایوان میں شرکت نہ کر سکتے ہوں تو چیئرمین یا اسپیکر حکومت کو ایسے رکن کی طلبی کا حکم دے سکتا ہے۔

زیرِ نظر حصہ سوم میں مندرجہ بالا تناظر میں آرڈیننس کے ذریعے قانون سازی، سینیٹ اجلاسوں کے لیے آئینی پابندیوں اور قواعد و ضوابط نیز اراکین پارلیمنٹ کے ایوان کے اجلاسوں میں شرکت کا حق اور سینیٹ کے استحقاق جیسے اہم موضوعات پر تقاریر شامل ہیں۔

باب نمبر ۸

آرڈیننس کے ذریعہ قانون سازی

پاکستان کا انتظام ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت دو ایوانی مقننہ کے ذریعے چلایا جاتا ہے۔ آئین کے مطابق حکومت کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک مقررہ مدت کے نوٹس کے ساتھ کسی بھی مجوزہ قانون کو دونوں ایوانوں میں بحث مباحثہ اور منظوری کے لیے پیش کرے تاکہ ایوان اگر ضروری سمجھے تو مملکت اور عوام کے مفاد میں مجوزہ قانون میں ترمیم و اضافہ کر سکے۔ لیکن بعض اوقات کسی ہنگامی ضرورت کے پیشِ نظر حکومت کو اختیار ہوتا ہے کہ قانون سازی کے مقررہ طریقے سے انحراف کرتے ہوئے آرڈیننس کے ذریعے قانون نافذ کر دے۔ ایسے قانون کی عمر چار ماہ ہوتی ہے اور اصولاً حکومت کو پہلی فرصت میں جاری کردہ آرڈیننس پارلیمنٹ کے سامنے پیش کرنا ہوتا ہے۔ لیکن حکومتیں بعض اوقات نہ صرف یہ کہ کسی ہنگامی ضرورت کے بغیر ہی بلکہ در حقیقت بدنیتی کی بنا پر آرڈیننس جاری کرتی ہیں اور پھر آرڈیننس کے ذریعے جاری کردہ ایسے قوانین کو پارلیمنٹ میں آخر تک پیش کرنے سے کتراتی ہیں۔

پروفیسر خورشید احمد نے مختلف مواقع پر قانونی اور آئینی حوالوں سے اس پر توجہ دلائی اور اپنے بھرپور تعاون کے ذریعے حکومت میں اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کی کہ وہ پارلیمنٹ کے ذریعے عمومی انداز میں قانون سازی کرے۔

جناب چیئرمین! میری تحریکِ استحقاق بہت صاف ستھری ہے اور اس کا مرکزی مسئلہ آرڈیننس کے ذریعے سے قانون سازی ہے۔ میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ وزیرِ قانون کے عدم تعاون کے باوجود آپ نے اپنے فرائض منصبی کو ذمہ داری سے ادا کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ کسی شخصیت کا نہیں پورے ملک، قانون، دستور اور سینیٹ کا معاملہ ہے۔

جنابِ والا! میں بالکل دو اور دو چار کی طرح بات کروں گا۔ آرڈیننس کے ذریعہ قانون کی تشکیل قانون سازی کے بنیادی اصول کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ قانون سازی اصل میں عوام کے نمائندوں پر مشتمل پارلیمنٹ کا حق ہے۔ صرف نو آبادیاتی دور میں یہ ہوتا ہے کہ انتظامیہ کو یہ اختیار دیا جائے۔

جناب چیئرمین! جہاں تک میری معلومات ہیں، ہندوستان کی تاریخ میں ۱۹۱۵ء کے ایکٹ کے آرٹیکل ۷۲ کے تحت گورنر جنرل کو یہ اختیار دیا گیا تھا۔ اس کے بعد پھر ۱۹۴۵ء کے ایکٹ میں سیکشن ۴۲ بھی اسی سے متعلق ہے۔ اس بنیاد پر ہی ہندوستان اور پاکستان کے وساتیر میں اس کی گنجائش پیدا کی گئی ہے۔ ہندوستان میں آپ کو معلوم ہے کہ جب دستور بنا ہے تو اس مسئلے پر بڑی مفصل بحث ہوئی۔ اس وقت ڈاکٹر امبیڈکر (B. R. Ambedkar)، جو وزیرِ قانون تھے اور دستور کی تدوین کی قیادت کر رہے تھے، انہوں نے اس کی مزاحمت کی اور خاص حالات کی بنا پر چھ ہفتے کے لیے صرف ایک بار آرڈیننس آنے کا معاملہ طے کیا گیا۔ میں آپ کو ایک کتاب کا حوالہ دیتا ہوں۔ کتاب کا نام Commentary on the Indian Constitution ہے اور اس کا مصنف Arvind P. Datar (اشاعت دوم ۲۰۰۷ء) ہے، جس میں وہ کہتا ہے کہ:

> ”یہ کہ دستور ساز اسمبلی کی بحث سے پتہ چلتا ہے کہ آرڈیننس جاری کرنے کی طاقت کو ایک ناگزیر برائی کے طور پر سمجھا جاتا تھا اور اسے غیر معمولی حالات سے نمٹنے کے لیے استعمال کیا جانا تھا نہ کہ سیاسی انجام سے بچنے کے لیے۔ آرڈیننس جاری کرنے کے اختیار کا استعمال 'آئین' کے ساتھ دھوکہ دہی کے لیے نہیں کیا جائے گا جسے (آئینی) عقیدے اور خواہش کے ساتھ مدون کیا گیا ہے۔

یہی لفظ 'فراڈ' Durga Das Basu نے بھی بھارتی آئین کے متعلق اپنی تشریح میں لکھا ہے کہ اپنی اصل کے اعتبار سے آرڈیننس دستور کے ساتھ دھوکہ ہے اور صرف ناگزیر برائی کے طور پر، خاص حالات میں جن کی توجیہ کی جا سکے اور جو جواز رکھتے ہوں، یہ کیا

جاسکتا ہے۔ جنابِ والا! یہ پس منظر ہے۔ تاہم پاکستان میں بدقسمتی سے سول اور فوجی آمریتوں نے غیر معمولی حالات کے لیے دی گئی اس گنجائش کو بری طرح سے غلط استعمال کیا ہے۔ زیادہ تر قانون سازی آرڈیننس کے ذریعے اور بہت کم باقاعدہ طریقے سے ہوئی ہے۔ سو، سو صفحات کے قوانین، جن پر پارلیمنٹ کو کئی کئی مہینے صرف کرنے چاہییں، چشمِ زدن میں آرڈیننس کے ذریعے نازل ہو جاتے ہیں اور پھر ان کو ایک بار معمولی تبدیلی کے ساتھ دوبارہ جاری کر دیا جاتا ہے۔ یہ مثالیں بھی موجود ہیں کہ گیارہ گیارہ بار ایک ہی آرڈیننس کو توسیع دی گئی۔ بلاشبہ یہ پارلیمنٹ، دستور اور قانون سازی کے ساتھ ایک مذاق ہے۔

جنابِ والا! میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ سپریم کورٹ نے بھی اس مسئلے پر اپنے متعدد فیصلوں میں بات کی ہے۔ میں خاص طور پر آپ کی توجہ جسٹس افضل میاں، جسٹس سجاد علی شاہ اور جسٹس سلیم اختر کے سامنے سپریم کورٹ میں آنے والے کیس (نمبر ۲۶۳ پی ایل ڈی ۱۹۹۴ء) کی جانب دلاؤں گا جس میں اس مسئلے کو بہت صاف الفاظ میں لیا گیا ہے اور وہ یہ ہے۔

Re-enactment of an expired Ordinance…….

جناب چیئرمین! یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اصل میں فیصلہ re-promulgation پر ہے۔ لیکن یہاں انہوں نے لفظ re-enactment استعمال کیا ہے۔

"اگر قومی اسمبلی تحلیل نہیں ہوئی تو صدر آئین کے آرٹیکل ۸۹ کے مطابق ایک آرڈیننس کو قومی اسمبلی میں پیش کیے بغیر دوبارہ جاری کر کے قومی اسمبلی کے قانون سازی کے اختیارات پر قبضہ نہیں کر سکتے۔ تاہم اگر قومی اسمبلی تحلیل ہو گئی ہے اور اس کے انتخابات ایسی وجوہات کی بناء پر جن کا صدر سے تعلق نہیں مقررہ مدت کے اندر نہیں ہو پاتے، اور اس طرح کی تاخیر کو مجازِ عدالت نے جائز سمجھا، تب صدر ایک آرڈیننس کو دوبارہ نافذ کرنے کا مجاز ہو گا۔ واضح فلسفہ یہ ہے کہ قانون سازی کا اختیار اسمبلی کے پاس ہوتا ہے۔ جب تک اسمبلی موجود ہو اس اختیار کو ریاست یا صوبے کے سربراہ کے ذریعے غصب نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اسمبلی کو

معقول وجہ سے تحلیل کر دیا جائے۔ تو مذکورہ بالا صورت حال باقی نہیں رہے گی"۔

پھر کہتے ہیں:

"قومی اسمبلی تحلیل نہیں ہے صدر آئین کے آرٹیکل ۸۹ کے مطابق قومی اسمبلی میں پیش کیے بغیر ایک ہی آرڈیننس کو دوبارہ جاری کر کے قومی اسمبلی کے قانون سازی کے اختیارات کو غصب نہیں کر سکتے"۔

جنابِ والا! اس سب کے پس منظر میں پارلیمانی کمیٹی نے بھی اس مسئلے پر تفصیلاً غور کیا تھا۔ میری رائے یہ تھی کہ آرڈیننس کی اجازت کی دفعہ کو ختم ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر ہم پارلیمنٹ کی بالادستی قائم نہیں کر سکیں گے اور مقننہ کو انتظامیہ کے چنگل سے آزاد نہیں کر سکیں گے لیکن بہر حال میں اپنے ساتھیوں کو قائل نہیں کر سکا۔ میں نے اپنے اختلافی نوٹ میں اس کا اظہار کیا ہے۔ لیکن جس پر ہم سب متفق ہو گئے وہ یہ ہے کہ اگر ایک بار کوئی آرڈیننس آجائے تو اس کے بعد صدر، گورنر یا انتظامیہ کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ محض اپنی مرضی سے اس کو توسیع دے۔ اگر مجبوری ہو اور توسیع کرنا ہی پڑے تو اس کے لیے ان کو پارلیمنٹ میں آنا پڑے گا اور پارلیمنٹ کا کم از کم ایک ایوان قرارداد کے ذریعے سے انہیں اس بات کی اجازت دے کہ متعلقہ آرڈیننس کو ایک بار اور صرف ایک بار توسیع دی جا سکتی ہے۔

جنابِ والا! ۱۸ویں ترمیم میں یہ بات اس طرح کہی گئی ہے:

"ترمیم شدہ آرٹیکل ۸۹ کے مطابق کوئی بھی ایوان ایک قرارداد کے ذریعے اس آرڈیننس میں مزید ایک سو بیس دن کی توسیع کر سکتا ہے اور یہ توسیع شدہ مدت کے ختم ہونے پر منسوخ ہو جائے گا یا اس مدت کے ختم ہونے سے پہلے اگر ایوان کی کوئی قرارداد اسے نامنظور کرتی ہے تب بھی مدت سے پہلے آرڈیننس ختم ہو جائے گا۔ مزید یہ کہ آرڈیننس کی مدت میں توسیع صرف ایک بار کی جا سکتی ہے"۔

جنابِ والا! ۱۸ویں دستوری ترمیم نے اس طرح ایک بڑا اہم کام یہ کیا ہے کہ کم از کم

اب آرڈیننس کی حکمرانی کو محدود کر دیا ہے۔ اب آپ دیکھیے کہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ۱۹اپریل ۲۰۱۰ء کو اس ترمیم پر دستخط ہوتے ہیں اور اس کے تیسرے دن آرڈیننس ۲۱اپریل ۲۰۱۰ء کو آجاتا ہے۔ ۲۱اپریل، یعنی ۱۸ویں ترمیم کے دستور کا حصہ بن جانے کے تیسرے دن۔

جنابِ والا! اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۸ویں ترمیم میں کچھ کمزوریاں اور خامیاں ہیں لیکن حقیقت میں یہ ایک تاریخی پیش رفت ہے اور منظوری کے بعد اب یہ ترمیم دستور کا حصہ بن گئی ہے۔ اپنے نفاذ کے بعد وہ ان تمام آرڈیننسوں پر نافذ العمل ہے جو دستور کا حصہ بننے سے پہلے جاری کیے گئے۔ اگر ۱۹ تاریخ سے پہلے کوئی آرڈیننس دوبارہ جاری ہو جاتا تو میرا اعتراض وارد نہ ہوتا۔ میری دلیل یہی ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر ترمیم پر دستخط ہونے کے ایک گھنٹے بعد بھی آرڈیننس جاری ہوا ہے تو وہ دستور کی خلاف ورزی ہے۔ رولز آف بزنس کی رو سے ایک قانون اگر اس وقت جاری ہوتا ہے جب ترمیم گزٹ ہو چکی ہے تو ہمیں اس پہلو کو بھی دیکھنا پڑے گا کہ دستور سے متصادم ہونے کی صورت میں اب اس کی کیا حیثیت ہے۔ ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ جو آرڈیننس ۲۰ تاریخ کو گزٹ ہو رہا ہے، اگر وہ ۱۹ تاریخ کو دستور کی ترمیم کے خلاف ہے تو کیا اسے ساقط ہو جانا چاہیے تھا یا مؤثر ہو جانا چاہیے۔ (۶مئی ۲۰۱۰ء)

۱۸ویں ترمیم کی منظوری سے قبل آرڈیننس کا اجراء

جناب چیئرمین! آپ کے ارشاد کے مطابق گذشتہ تین دنوں میں اپنی مصروفیات اور ملک سے باہر ہونے کے باجود میں نے کوشش کی ہے کہ جو بھی آرڈیننس مجھے مل سکے ہیں انھیں دیکھ لوں۔ انھیں پڑھنے کے بعد میں آپ کی توجہ کے لیے اس وقت چند باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ پہلی بات یہ ہے کہ آرڈیننس معمول کی بات نہیں ہے بلکہ ایک استثنا ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ آرڈیننس کے اجراء کے بارے میں ۱۸ویں آئینی ترمیم میں پارلیمنٹ کا عندیہ بہت ہی واضح طور پر سامنے آگیا ہے۔ ایک چیز ہے قانون اور ایک چیز ہے قانون کی روح۔ دستور اور دستور کی روح ان دونوں کو بیک وقت سامنے رکھا جاتا ہے۔ ان

میں کوئی فاصل نہیں کیا جاتا۔ اسی لیے جب بھی ہم ایسے معاملات پر غور کرتے ہیں تو اس کی دو جہتیں سامنے رکھنی ہوتی ہیں۔ ایک اس کی قانونی حیثیت اور جواز اور دوسری اس کی ملکیت اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں جڑے ہوئے ہیں۔ میں نے سنہ ۲۰۰۷ء سے لے کر سنہ ۲۰۱۰ء تک کے جتنے بھی آرڈیننس پڑھے ہیں، یہ سب میرے پاس یہاں پر موجود بھی ہیں۔ خود اس حکومت کے دور میں ۲۰۱۰ء میں جتنے بھی آرڈیننس آئے ہیں، وہ بھی سب میں نے دیکھے ہیں۔ کسی ایک میں بھی جنابِ والا! مجھے یہ نہیں ملا کہ منظور فلاں تاریخ کو ہوا ہے اور گزٹ نوٹیفکیشن فلاں تاریخ کو ہوا ہے۔

اس کے برعکس یہ جو ۱۲ آرڈیننس ہیں[1] ان میں، میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ منظوری کی تاریخ الگ دی گئی ہے اور اشاعت کی تاریخ الگ دی گئی ہے۔ یہ ایک بڑا اہم نکتہ ہے جناب چیئرمین! اس ضمن میں ایک تو میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا وجہ ہے کہ پہلی مرتبہ یہ فرق یہاں کیا گیا ہے، دوسرے اس سے ایک اور مسئلہ پیدا ہوا ہے: یہ کہ ایک قانون کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب اس پر دستخط ہوں یا اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ گزٹ ہو؟ اس سے پہلے میں نے جو بھی دیکھا ہے خواہ وہ قانون ہو یا آرڈیننس ہو اس میں گزٹ ہی منظوری کا اعلان ہے۔ گزٹ ہی قانون سازی کے مکمل ہونے کا اعلان ہے۔ ان دونوں کی تاریخوں میں جو فرق کیا گیا ہے یہ شک پیدا کرتا ہے اور بہر حال میں یہ سوال کرنے کے لیے مجبور ہوں کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ دستخط ۲۰ تاریخ کو ہوئے لیکن اس پر پچھلی تاریخ ڈالی گئی اور وہ مجرم ضمیر تھا جس کی بنا پر یہ کہا گیا کہ دستخط اس وقت ہوئے اور یہ اب آرہا ہے۔ حتٰی کہ آپ یہ دیکھیے کہ ۱۸ویں ترمیم کی منظوری اور تاریخ اشاعت میں بھی دو دن کا فرق ہے۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ فرق کیوں ہے اور یہ پورا عمل ماضی کی تمام نظیروں سے مختلف کیوں ہے؟

---

[1] یہ بارہ آرڈیننس بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، مصالحت کاری، اسلامی صارفین کا تحفظ، بجلی کی پیداوار اور تقسیم، قانون فوجداری، خواتین کی نظر بندی، لاؤڈ اسپیکر کے استعمال، سول سرونٹ ترمیمی آرڈیننس، ناجائز منافع خوری اور قیمتوں پر کنٹرول اور اسلام آباد میں صارفین کے تحفظ سے متعلق تھے۔

جناب چیئرمین! اگلی بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ۱۸ اپریل کو قومی اسمبلی نے ۱۸ ویں ترمیم متفقہ منظور کر لی۔ آپ نے اسی دن اس کی خوشی منائی، دعوتیں شروع ہو گئیں، انعام و اکرام کا سلسلہ شروع ہو گیا حتٰی کہ آپ نے قیدیوں کو غیر معمولی رہائی بھی دے دی۔ یہ سارے کا سارا کام آپ ۱۸ ویں ترمیم کے الفاظ و معانی کو مشتبہ کرنے کے لیے کر رہے ہیں۔ سینیٹ نے ۱۵ تاریخ کو اسے منظور کیا۔ سوال یہ ہے کہ اگر ۱۸ تاریخ کو آرڈیننس دوبارہ جاری کیا گیا ہے تو کیا صدرِ محترم اور وزارتِ قانون کے علم میں یہ بات نہیں ہے کہ پارلیمنٹ نے آرڈیننس دوبارہ جاری کرنے کے بارے میں اپنا فیصلہ دے دیا ہے؟ یہ عندیہ بالکل واضح ہے۔ اس کا پیغام یہ تھا کہ اب آرڈیننس کے مکرر اجراء کا کام اس دستور کے مطابق ہو گا، ماضی کے مطابق نہیں ہو گا۔ حقِ ملکیت والی یہ وہ بات ہے جس کی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ جو ترمیم کی روح ہے اس کی بے شرمی سے خلاف ورزی کی گئی ہے۔

اس بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ دستور اور پالیمنٹ کو بائی پاس کیا گیا ہے۔ بھارتی اور پاکستانی دستور اور قانون میں جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں کہ ایسی حرکت دستور کے خلاف دھوکہ بازی ہے یہ پارلیمنٹ کے خلاف دھوکہ بازی ہے۔ پارلیمنٹ کو بائی پاس کیا گیا ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر میں کہتا ہوں کہ کمیٹی برائے قانون سازی کے ساتھ حق ملکیت کا پہلو بھی آپ اپنے سامنے رکھیں اور ان تمام معاملات پر غور کرنے کے بعد پھر آپ رائے دیں۔ میں آپ کی خدمت میں یہ تمام قوانین بھجوا رہا ہوں۔ ان پر آپ نگاہ ڈال کر دیکھیں مجھے ماضی میں ایسا ایک کیس بھی نہیں ملا جس میں منظوری کی تاریخ الگ بتائی گئی ہو۔ (۱۲ مئی ۲۰۱۰ء)

کیا آرڈیننس کے ذریعے قانون سازی کو ایوان ختم کر سکتا ہے؟

جنابِ والا! میں تین باتیں بہت ہی اختصار سے کہوں گا۔ پہلی بات یہ ہے کہ یہ اس ہاؤس کا دستوری حق ہے کہ ایک آرڈیننس کے آنے کے بعد، چاہے اس کے خلاف ایک گھنٹے کے بعد کوئی قرارداد پاس کر دیں یا بعد میں، قرارداد پاس ہوتے ہی وہ آرڈیننس ختم ہو جاتا ہے۔ چار مہینے تو آخری حد ہے۔ اس لیے جو بات ہم نے کہی ہے وہ دستور اور قانون کی بنیاد پر ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ کوئی بھی مسئلہ فیصلہ طلب ہو سکتا ہے لیکن پارلیمنٹ با اختیار ہے۔ عدالت کا کام یہ ہے کہ پارلیمنٹ نے جو قانون سازی کی ہے اس کی تشریح کرے۔ تاہم یہ پارلیمنٹ کا اختیار ہے کہ وہ کسی بھی قانون کو کسی بھی وقت بنا سکتی ہے، ختم کر سکتی ہے اور ترمیم کر سکتی ہے۔ فیصلہ طلب ہونے کا معاملہ پارلیمنٹ سے باہر بات کرنے کی حد تک ہے اور کسی انتظامی حکم سے متعلق ہے لیکن یہ معاملہ قانون سازی سے متعلق نہیں ہے۔

جنابِ والا! میں تیسری بات جناب وزیرِ قانون سے پوچھنا چاہوں گا کہ ۲۷ اگست کو آرڈیننس آیا ہے[1]۔ وہ خود فرما رہے ہیں کہ ۲۹ اگست کو اسمبلی کا اجلاس ہوا ہے۔ اب اس اسمبلی کو طلب کب کیا گیا ہے؟ اس اجلاس کا نوٹس کب جاری کیا گیا ہے؟ جنابِ والا! اس کا نوٹس ۲۷ اگست سے پہلے جاری کیا گیا ہے تو پھر یہ مجرمانہ حرکت ہے کیونکہ اسمبلی تو آپ نے طلب کی ہوئی ہے اور اس کے بعد آپ آرڈیننس لا رہے ہیں۔ اگر اسمبلی ۲۷ اگست کے بعد طلب کی گئی ہے تو میں اس کو نظر انداز کر دیتا ہوں لیکن اسمبلی ۲۷ سے پہلے طلب ہوئی ہے اور اس کا نوٹس بھی دیا گیا ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اسمبلی کے طلب کیے جانے کے بعد آپ آرڈیننس لائے ہیں اسی لیے یہ مجرمانہ فعل ہے۔ (۲۱ ستمبر ۲۰۰۵ء)

پارلیمنٹ کے اجلاس کے دوران آرڈیننس کا اجراء

جنابِ والا! یہ ایک روش ہے کہ جب چاہو دستور کو توڑ دو۔ جب چاہو قانون کو توڑ دو۔ جمہوریت محض انتخابات کا نام نہیں بلکہ جمہوریت دراصل قانون کی حکمرانی کا نام ہے۔ ہم نے افراد کا نہیں پارلیمنٹ کی بالادستی اور اداروں کا تحفظ کرنا ہے۔ افراد تو آتے جاتے رہتے ہیں، ادارے باقی رہتے ہیں۔ اگر آپ نے اداروں کو اس طریقے سے دبا دیا، نظر انداز یا رد کیا تو یہ جمہوریت اور اس ملک کے مستقبل کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔

---

[1] یہ آرڈیننس پبلک سروس کمیشن کی تنظیم نو سے متعلق تھا جس کے ذریعے تنظیم نو کے نام پر پبلک سروس کمیشن کے اراکین کی مدت ملازمت پانچ سال سے کم کر کے تین سال کر دی گئی اور فوری طور پر دو ممبران کو فارغ کیا گیا کیونکہ ان ممبران نے بعض اعلیٰ سرکاری عہدوں پر تقرریوں سے متعلق حکومت سے وضاحت مانگی تھی۔

آپ دیدہ دلیری دیکھیے کہ سینیٹ کا اجلاس جاری ہے اور دستور یہ بات کہتا ہے کہ کوئی بھی مجوزہ قانون دونوں ایوانوں میں سے کسی میں بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ ٹھیک ہے آرٹیکل ۸۹ کے اندر آرڈیننس کی گنجائش موجود ہے۔ میں نے بھی اس کو پڑھا ہے لیکن ساتھ ہی اس کے اندر یہ بات بھی ہے کہ قانون سازی کا عمومی طریقہ یہ نہیں ہے۔ جس وقت سینیٹ میں بل متعارف نہیں ہو سکتے تھے اس وقت بلاشبہ مجبوری کا معاملہ تھا لیکن اب اگر قانون دوبارہ لاگو کرنے کے لیے اس کو سینیٹ میں لانے کی بجائے آرڈیننس کے ذریعے لایا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ قانون سازی کا یہ طریقہ پارلیمنٹ کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔ اس معاملے میں دو اور بہت بڑی غلطیاں ہوئی ہیں۔ پہلی چیز یہ ہے کہ آرڈیننس آتا ہے ۱۵ دسمبر کو اور اسے ۹ نومبر سے مؤثر کیا جاتا ہے۔ یہ بھی دستورِ قانون اور روایات کے خلاف ہے۔ یہ بین الاقوامی قوانین اور طور طریقوں کے بھی خلاف ہے کہ آپ مؤثر بہ ماضی حکم جاری نہیں کر سکتے۔

اگلی چیز آپ دیکھیں کہ سپریم کورٹ کے ایک نہیں کئی فیصلے موجود ہیں کہ آرڈیننس اگر اپنی مدت پوری کر کے ختم ہو جاتا ہے تو اس کے بعد دوبارہ جاری نہیں ہونا چاہیے بلکہ پھر اسے بل کے ذریعے سے آنا چاہیے۔ یہ سپریم کورٹ کا فیصلہ ہے لیکن ہمارے ہاں سپریم کورٹ کا کوئی احترام نہیں ہے۔ توہینِ عدالت کا قانون تو آپ لا رہے ہیں لیکن درحقیقت مستقل توہینِ عدالت کے خود مرتکب ہو رہے ہیں۔ یہی نہیں، آپ کو معلوم ہو گا کہ سوئی گیس کے ملازمین کے معاملے میں دوبار سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا ہے حتٰی کہ توہینِ عدالت بھی قرار دیا ہے۔ آج تک اس پر عمل درآمد نہیں کیا گیا۔ آج کے اخبارات میں لاہور کے ایک اسکول کے بارے میں یہ آیا ہے کہ سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے فیصلے اور تمام تر تنبیہ نظر انداز کر دی گئی۔ جو قبضہ گروپ وہاں پر قائم ہے اس کے مفادات ہیں اور کسی کے پاس یہ اتھارٹی نہیں ہے کہ وہ سپریم کورٹ کے فیصلے کو نافذ کرے۔ اسی طریقے سے جنابِ والا! پی ٹی سی ایل کے ڈیلی ویجز ملازمین کا معاملہ ہے وہ احتجاج کر رہے ہیں کوئی سننے والا نہیں ہے۔ پٹرول کی قیمتیں بڑھ رہی ہیں حالانکہ پچھلے تین ہفتوں سے بین الاقوامی مارکیٹ میں پٹرول

کی قیمتیں برابر نیچے گئی ہیں لیکن ہمارے یہاں برابر بڑھائی جارہی ہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ ایک خاص ذہن اور ایک خاص رویہ ہے جس کے تحت دستور کو نظر انداز کیا جارہا ہے۔ قانون کو نظر انداز کیا جارہا ہے۔ لوگوں کے مسائل سے اغماض برتا جارہا ہے۔ جو مطالبات ہورہے ہیں حق پر مبنی ہیں ان کو نظر انداز کیا جارہا ہے۔ غلط بیانی کی جارہی ہے۔ غلط بیانی کے ذریعے ہم قوم کو کہاں لے جارہے ہیں؟

ہم جس بنا پر احتجاج کررہے ہیں وہ یہی ہے کہ مسئلہ محض ایک ایل ایف او کا نہیں ہے مسئلہ یہ ہے کہ کیا ایک فرد کو اس بات کا اختیار ہے کہ وہ دستور سے بالا ہو جائے، قانون سے بالا ہو جائے، پارلیمنٹ سے بالا ہو جائے۔ جنابِ والا! یہ کسی ایک فرد کا مسئلہ نہیں ہے یہ اصول کا مسئلہ ہے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ جب تک بنیادی طور پر پارلیمنٹ اپنا صحیح مقام حاصل نہیں کرتی اور جب تک دستور کو اس کی صحیح شکل میں بحال نہیں کیا جاتا حکومت یہ مذاق کرتی رہے گی۔ ہم ایسے عمل کے اندر نہ پہلے کبھی پارٹی تھے، نہ ہیں، نہ بننا چاہتے ہیں۔ ہاں جس وقت آپ یہ مان لیں کہ دستور سازی صرف پارلیمنٹ کا کام ہے، آپ قانون لائیں، چاہے سینیٹ میں لائیں چاہے اسمبلی میں لائیں، ہم اس پر بحث کریں گے۔ اس کے جواز کو دیکھیں گے۔ جو قابلِ قبول ہوا اس کو قبول کریں گے جسے بدلنا ہے اسے بدلنے کی کوشش کریں گے۔ یہی طریقہ ہوتا ہے پارلیمنٹ کو چلانے کا لیکن جس طریقے سے آپ معاملات کو لے کر چل رہے ہیں وہ مکمل طور پر دستور کی خلاف ورزی ہے اور یہ چیز ہمیں کسی بھی پہلو سے قبول نہیں ہے۔

جنابِ والا! اس بنیاد پر ہم اپنے احتجاج کو جاری رکھتے ہیں اور آپ کے توسط سے پوری قوم سے یہ بات کہنا چاہتے ہیں کہ جہاں اپوزیشن اس ملک کے مسائل کو حل کرانا چاہتی ہے اور اس میں مثبت کردار ادا کرنا چاہتی ہے وہیں یہ بات بھی ضروری ہے کہ جب تک وہ ادارے جو قانون کے محافظ ہیں 'دستور کے' وہ ادارے جن کے بغیر جمہوریت نہیں چل سکتی، ان کو صحیح طرح کام کرنے کا موقع نہیں دیا جائے گا ہم جمہوریت کی گاڑی کو پٹڑی پر لانے میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ ان الفاظ کے ساتھ احتجاجاً میں اپنے ساتھیوں سے بھی کہتا ہوں کہ جب تک کہ

بنیادی ضابطہ طے نہیں ہو جاتا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے کہ ہم اس وقت تک ایوان کی کارروائی میں شریک ہوں۔ (۱۷ دسمبر ۲۰۰۳ء)

جنابِ والا! یہ بڑا سنجیدہ مسئلہ ہے اور میری نگاہ میں اس میں تین ایسی چیزیں ہیں جن پر اس ایوان کو گرفت کرنی چاہیے۔ پہلی بات، ظفر علی شاہ نے اس کی طرف متوجہ کیا ہے کہ ۱۶ تاریخ کو احتساب آرڈیننس میں ترمیمی آرڈیننس آیا ہے۔ ہمارے علم کی حد تک یہ آرڈیننس کسی میڈیا یا پریس میں بھی نہیں آیا۔ آج سامنے آنے والی خبروں میں اس بات کو باقاعدہ واضح کیا گیا ہے کہ اس کو خفیہ رکھا گیا ہے۔ یہ کہاں تک صحیح ہے؟ اگر صحیح ہے تو اس کے پیچھے کیا کھیل ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ ۱۶ تاریخ کو اعلان ہو گیا تھا کہ اسمبلی اور سینیٹ کے اجلاس ۲۰ تاریخ کو ہوں گے۔ اس اعلان کے بعد آرڈیننس کا آنا لفظاً و معناً دونوں طرح سے دستور کے خلاف ہے۔ تیسری چیز یہ ہے کہ ۲۰ ستمبر کو سینیٹ کا اجلاس شروع ہوا ہے آج یکم اکتوبر کو اجلاس ملتوی ہو رہا ہے۔ آخر گیارہ دنوں کے بعد اس کو ایوان میں کیوں لایا گیا ہے جبکہ دستور یہ مطالبہ کرتا ہے کہ آرڈیننس پہلی فرصت میں ایوان میں لایا جائے گا۔

جہاں تک آرڈیننس کے متن کا تعلق ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ بدنیتی پر مبنی ہے، اس کے ذریعہ احتساب کے نظام کو درہم برہم کرنا ہے۔ وزارتِ قانون یہ چاہتی ہے کہ جہاں چاہے مقدمات لگوائے اور جہاں چاہے منتقل کرے۔ یہ پورے کے پورے احتساب کے طریقۂ کار کو تباہ کرنے کی کوشش ہے۔ ڈیڑھ سال سے احتساب کا نیا قانون ایوان میں ہے، اس پر اتفاق رائے نہیں ہو رہا ہے۔ دوسری جانب این آر او کے سلسلے میں جو کچھ قوم کے سامنے آیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس معاملے میں یہ حکومت مجرم ہے اور بدنیتی پر مبنی کام ہوئے ہیں۔ اس بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ ایوان کو اسے مسترد کرنا چاہیے۔

(یکم اکتوبر ۲۰۱۰ء)

باب نمبر ۹

آئینی پابندیاں اور قواعد کار

- ۱ -

سینیٹ کے قواعد کار: جناب چیئرمین! میں اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتا ہوں کہ بطور چیئرمین آپ نے ہمیشہ رولز آف بزنس کی زیادہ سے زیادہ پیروی کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور جہاں کسی انحراف کا امکان ہو وہاں بھی رولز میں جو گنجائش ہے اس سے استفادہ کیا ہے۔ میں اسی پس منظر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ رولز کے مطابق تحریکِ التواء اور توجہ دلاؤ نوٹس ہمارا حق ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔

یہ ٹھیک ہے کہ اس اجلاس کے لیے بزنس کمیٹی میں ہم نے تین چار موضوعات طے کیے اور آپ اسی کی مناسبت سے چل رہے ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان موضوعات سے ہٹ کر جتنی تحاریکِ التواء ہم نے پیش کی ہیں یا توجہ دلاؤ نوٹس دیے ہیں انھیں نظر انداز کر دیا جائے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس پورے سیشن میں ایک بار بھی قاعدے کے مطابق نہ تحاریکِ التواء آئی ہیں اور نہ توجہ دلاؤ نوٹس پیش ہوئے ہیں حالانکہ ان کو پہلے ہی سے دن کی کارروائی کا حصہ ہونا چاہیے۔ اس سے قبل ہمیشہ یہ ہوتا رہا ہے کہ دن کی کارروائی کی روشنی میں جو تحریکِ التواء آتی ہیں، ان کو آپ شامل کرتے ہیں اور سب متعلقہ لوگوں کو بھی بتاتے ہیں۔ اسی طرح توجہ دلاؤ نوٹس ایک خاص ترتیب سے ایجنڈے کا حصہ بنتا ہے لیکن اس مرتبہ یہ نہیں ہوا ہے۔ چنانچہ ہمارے صوبے کا مسئلہ ہو یا ڈرون حملوں اور خود مختاری کی پامالی کا مسئلہ، وہ زیر بحث نہیں آرہے جبکہ ہم نے ان سب کے اوپر تحاریکِ التواء اور توجہ دلاؤ نوٹس دیے ہوئے ہیں۔ یہ قواعد کی ایک خلاف ورزی ہے اور میں آپ کو متوجہ

کرنا چاہتا ہوں کہ یہ روایت قائم نہیں رہنی چاہیے۔

جناب چیئرمین! یہ اس کے باوجود ہے کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ حکومت کے پاس کوئی بزنس نہیں تھا۔ ہم نے یہ مسائل رکھے اور آپ نے قبول بھی کیے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ رولز کے تحت تحاریک التواء اور توجہ دلاؤ نوٹس جو آنے چاہییں، وہ نہ آئیں۔ اس لیے اس دفعہ اگر غلطی ہوئی بھی ہے، تو آئندہ کے لیے اس کو مثال نہ بنایا جائے اور اس کی تلافی کی جائے۔

(۳۰ ستمبر ۲۰۱۰ء)

سینیٹ کے نئے قواعد کار تاریخی تناظر میں

جناب چیئرمین! میری نگاہ میں سینیٹ نے پارلیمانی روایات کو مستحکم کرنے، قومی معاملات کی اصلاح کرنے اور اپنے ملک کے حالات کو جمہوریت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے میں جو کردار ادا کیا ہے اس میں رولز آف بزنس کا بہت بڑا تعلق ہے۔ میں اسے بڑی سعادت سمجھتا ہوں کہ میں رولز آف بزنس کی تشکیل نو کے پورے عمل سے پہلے دن سے متعلق رہا ہوں۔ ۱۹۸۵ء میں جب ہم سینیٹ میں پہلی بار آئے تو مجھے یہ سعادت حاصل ہوئی اور میں نے یہ ایشو اٹھایا کہ ۱۹۳۵ء میں جو قواعد کار بنے تھے آنکھیں بند کر کے ۵۰ سال تک ان ہی کے اوپر عمل ہوتا رہا اور کسی نے یہ گوارا نہیں کیا کہ ان کو آزادی اور جمہوری مستقبل کو سامنے رکھ کر نظر ثانی کریں۔

میں اس وقت کے چیئرمین سینیٹ جناب غلام اسحاق خان کو خراجِ تحسین پیش کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا اور ایک کمیٹی بنادی جس میں میرے علاوہ سینیٹر سر تاج عزیز، سینیٹر جنرل سعید قادر اور کچھ دوسرے افراد شامل تھے۔ تین سال کی محنت سے ۱۹۸۸ء کے رولز تیار ہوئے جنہیں اس ہاؤس نے متفقہ طور پر قبول کیا اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی وجہ سے سینیٹ کی کارکردگی اور اس کے بعد قومی اسمبلی کی کارکردگی میں غیر معمولی بہتری ہوئی۔

پھر دوبارہ اس بات کی ضرورت تھی کہ ۲۰ سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے ان پر نظر ثانی کی جائے۔ میں اس موقع پر خصوصیت سے سینیٹر کرنل سیّد طاہر حسین مشہدی کو خراجِ تحسین پیش کروں گا۔ سابق وزیر شیر افگن نے بھی بڑا تعاون کیا اور محنت کی۔ پھر چھ سال آپ لوگوں نے لگائے۔ اور اس میں خصوصیت کے ساتھ میں کرنل مشہدی کی تائید کروں گا کہ اس مرحلہ میں آپ نے جتنی دلچسپی ذاتی طور پر لی ہے، اس کے لیے جتنا وقت دیا اور جس کھلے ذہن کے ساتھ تمام تجاویز پر غور کیا ہے یہ اپنی جگہ ایک بڑی روشن مثال ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ایسے معاملات میں کوئی بھی چیز حتمی نہیں ہوتی اور نہ ہی ان رولز کے بارے میں ایسا کہا جا سکتا ہے لیکن میں اگر یہ بات کروں تو شاید مبالغہ نہیں ہو گا کہ میں نے دنیا کی جتنی بھی پارلیمنٹوں کے قواعد وضوابط پڑھے ہیں ہمارے موجودہ رولز، الحمدللہ، ان میں ایک بہتر مقام رکھتے ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک بہت بڑا کام ہے جو سینیٹ نے کیا ہے۔ میں اس میں شامل تمام حضرات، تمام سینیٹ سیکرٹریز اور خصوصاً راجہ امین صاحب (سیکرٹری)، بابر صاحب (سیکرٹری) اور محبوب علی صاحب (ایڈیشنل سیکرٹری) کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر ایک نے اپنی ذمہ داری کا حق ادا کیا ہے۔ تاریخی تناظر میں نے اس لیے دیا ہے کہ یہ ساری بات ہمارے سامنے رہنی چاہیے۔ بلاشبہ پارلیمنٹ کی فرماں روائی کی حد کا تعین دستور کرتا ہے لیکن قواعد وضوابط اصل نقشۂ کار ہیں جس میں کام کرنا ہوتا ہے۔ تو یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ میں کمیٹی کے ارکان، آپ کو اور پورے سٹاف کو اور ان تمام افراد کو جنہوں نے ترامیم دیں اور اس کام میں حصہ لیا ہے ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے اس اقدام کی توثیق کرتا ہوں اور اسے جلد از جلد منظور کرنے کی درخواست کرتا ہوں۔

میں آپ کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں اور، الحمدللہ، ہم نے متفقہ طور پر تمام تجاویز آپ کے سامنے پیش کر دی ہیں۔ میری خواہش ہے کہ اب نئے رولز اپنی مکمل شکل میں ان تمام ترامیم کے ساتھ شائع ہوں۔ (۸ مارچ ۲۰۱۲ء)

۱۴ مئی ۲۰۰۸ء کو دو امریکی طیاروں نے باجوڑ ایجنسی میں ڈمہ ڈولا کے مقام پر مسجد اور مدرسہ پر میزائل حملہ کر کے ۱۱۴ افراد کو شہید اور متعدد کو زخمی کیا۔ اس حوالہ سے حکومت کو متوجہ کرنے اور بحث کرنے کے لیے سینیٹر پروفیسر خورشید احمد (اپوزیشن) اور سینیٹر کامران مرتضیٰ اور مولانا عبدالغفور حیدری (سرکاری بنچوں کے اراکین) نے تحریکِ التواء جمع کرائی۔ جس پر جناب سینیٹر انور بھنڈر نے یہ بحث چھیڑ دی کہ تحریکِ التواء کسی بھی مسئلے پر حکومتی ناکامی کے سبب حکومت کو متوجہ کرنے کے لیے حزبِ اختلاف کی جانب سے پیش کی جاتی ہے تاکہ پارلیمنٹ کی کارروائی کو روک کر فوری اہمیت کے اس مسئلے پر بات کی جائے۔ اس پر متعلقہ وزیر کو نوٹس دیا جاتا ہے وہ اس تحریک کی مخالفت کرتا ہے جبکہ محرک بتاتا ہے کہ تحریک پر بحث کیوں ضروری ہے۔ دونوں جانب کا مؤقف سننے کے بعد چیئرمین رولنگ دیتا ہے لیکن اس معاملے میں حکومتی اراکین نے تحریکِ التواء پیش کرنے کی کوشش کی جس پر انور بھنڈر نے بتایا کہ پارلیمانی تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ کیونکہ تحریکِ التواء پیش کرنے کا مطلب ہے کہ حکومت کسی معاملے پر اپنا کردار ادا کرنے میں ناکام ہوئی ہے جس پر اسے متوجہ کیا جا رہا ہے۔ جبکہ سینیٹر رضا ربانی نے کہا کہ قواعد وضوابط میں سرکاری بنچوں کے اراکین پر تحریکِ التواء پیش کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ چیئرمین نے اس مسئلے پر مزید بحث کرنے کا فیصلہ کیا۔ زیرِ نظر تقریر اسی بحث کے دوران کی گئی۔

تحریکِ التواء اور حزبِ اختلاف کے اراکین کا استحقاق: جناب چیئرمین! میرا خیال ہے جناب سینیٹر چوہدری محمد انور بھنڈر نے بہت صحیح متوجہ کیا ہے۔ یعنی حکومتی بنچوں پر بیٹھنے والے افراد کے لیے بہت سے راستے کھلے ہوئے ہیں۔ توجہ دلاؤ نوٹس[1] کا راستہ بھی ہے اور قاعدہ ۱۹۴ کا راستہ بھی ہے[2]۔ لیکن تحریکِ التواء میرے نزدیک صرف حزبِ اختلاف کے اراکین کا استحقاق ہے۔

---

[1] پارلیمنٹ کا کوئی بھی رکن عوامی اہمیت کے کسی بھی مسئلے کو زیرِ بحث لانے کے لیے توجہ دلاؤ نوٹس دے سکتا ہے۔

[2] کوئی بھی رکن کسی پالیسی، صورتِ حال، بیان یا کسی بھی مسئلے پر قاعدہ ۱۹۴ کے تحت پارلیمنٹ میں بحث کروا سکتا ہے۔

اگر ہم ان روایات کو باقی رکھیں تو یہ صحیح ہو گا۔ انور بھنڈر صاحب نے صحیح کہا ہے کہ یہ ان کا اپنی حکومت کے اوپر بے اعتمادی کا اظہار ہے۔ بلاشبہ ہم اس پر خوش ہیں کہ حکومتی بنچوں کے بعض اراکین ہمارا ساتھ دینے کو تیار ہیں لیکن وہ ہمیں تحریک پیش کرنے دیں اور پھر ہمارا ساتھ دیں۔

جناب چیئرمین! یہ بڑی دلچسپ بحث ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ رضا ربانی اس حد تک صحیح ہیں کہ رولز میں کہیں یہ لکھا ہوا نہیں ہے۔ لیکن رولز اور روایات دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ہمیں اس بات کو سمجھنا چاہیے کہ پارلیمانی زندگی کے اندر قواعد کے ساتھ ساتھ روایات بھی اپنا ایک اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ میں ان کی توجہ ایک اور مسئلے کی جانب مبذول کراؤں گا۔ لفظ censure motion ہم نے اس معنی میں استعمال نہیں کیا کہ اس کی اہمیت گر جائے گی۔ لیکن وہ اس قسم کی چیز نہیں ہے، یعنی stricto sensu censure motion (سخت ناراضگی کا اظہار) نہیں ہے، مجھے اس سے اتفاق ہے۔ میں ان کی توجہ اس جانب دلاؤں گا کہ اگر تحریک استحقاق ہو تو اس پر وزیر کو مخالفت کا اختیار نہیں ہے۔

تحریکِ التواء وہ چیز ہے کہ جس پر وزیر کو اعتراض کا اختیار ہے۔ کیوں؟ اگر سرکاری بنچوں کی طرف سے ایک چیز آرہی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ سرکاری پارٹی کی مرضی سے آرہی ہے اور وزیر اس کا حصہ ہے۔ چنانچہ اس کے اوپر وزیر کے اعتراض کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ لیکن چونکہ تحریکِ التواء اپوزیشن کی طرف سے آتی ہے اس لیے وزیر کو یہ حق دیا گیا کہ وہ اس پر اعتراض کرے۔ ممبر نے بتانا ہوتا ہے کہ وہ تحریک کیوں لا رہا ہے۔ جو اشارہ ہے اس چیز کی طرف، کہ سرکاری بنچوں کی طرف سے یہ نہیں آنا چاہیے، اگر سرکاری بنچوں کی طرف سے آتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ سرکاری بنچوں سے ایک چیز آرہی ہے اور انہی کا وزیر اس کی مخالفت کر رہا ہے۔ یوں یہ ایک واضح بات ہے لیکن اس کا اصل انحصار روایت کے اوپر ہے اور میرے علم کی حد تک تحریکِ التواء انڈیا اور برطانیہ دونوں جگہ اپوزیشن والے ہی پیش کیا کرتے ہیں۔

میں واضح کر دوں کہ یہ ایک نظری بحث ہے۔ میری گزارشات کا تعلق کسی شخص یا کسی مسئلہ سے نہیں تھا، بلکہ صرف ایک اصولی معاملے پر تھا۔ (۴ جون ۲۰۰۸ء)

وزراء کی جانب سے سینیٹ کے استحقاق کی خلاف ورزی: جناب چیئرمین! یہ مسئلہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ بد قسمتی سے گذشتہ چار سالوں میں ہمارا تلخ تجربہ ہے کہ وزرائے کرام اس ایوان کو اہمیت نہیں دیتے ہیں۔ یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ یہاں موجود ہوں اس لیے کہ ہر چیز کا ان کو علم ہوتا ہے۔ انھیں نوٹس دیا جاتا ہے، بلایا جاتا ہے اور قائدِ ایوان بے چارہ ان کو بار بار یاد دہانی کراتا ہے تاہم وہ غیر حاضر رہتے ہیں۔

میاں رضا ربانی نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ رولز میں آپ کو جو اختیار ہے وہ تو یہی ہے کہ آپ ان کو معطل کر سکتے ہیں۔ لیکن میں آپ کی توجہ ایک اور طرف بھی دلاؤں گا اور وہ ہے ایوان کی توہین۔ اس کی وضاحت May میں بھی اور Kaul میں بھی ہے اور دوسری کتابوں میں بھی کی گئی ہے۔ ان میں ایک بڑی اہم چیز ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر ایوان کو اس کے فرائض کی ادائیگی میں کوئی چیز رکاوٹ ڈالے تو یہ توہین ہے۔ چنانچہ میری نگاہ میں اگر اس ایوان کا جو عمومی بزنس ہے اس میں کوئی رکاوٹ ڈالتا ہے، خواہ وہ بھول چوک سے ہو یا اپنے اختیار یا حکم سے، تو اس طرح وہ ایوان کی توہین کرتا ہے۔

توہین کے سلسلے میں برطانوی پارلیمنٹ کی روایت موجود ہے کہ سزا کے جو بھی اختیارات ہیں، وہ سارے ہاؤس کو حاصل ہیں۔ اگر آپ اس عمومی اصول کو پیشِ نظر رکھیں، بجائے اس کے کہ آپ کسی ضمنی قاعدے کو لیں، تو پھر میری نگاہ میں آپ کو یہ اختیار ہے کہ آپ اس معاملے میں سزا دے سکتے ہیں[1] جو ان کے طرزِ عمل اور ایوان کے وقار کو سامنے رکھ کر دی جائے۔

(یکم فروری ۲۰۱۲ء)

---

[1] سینیٹ کے سوال وجواب کے سیشن میں متعلقہ وزراء کی موجودگی ضروری ہوتی ہے اس سلسلے میں ہر وزیر کو اطلاع کی جاتی ہے لیکن اس دن وفاقی کابینہ کے اجلاس کے سبب کافی دیر تک کوئی وزیر نہیں آیا۔ بعد ازاں وفاقی وزیر مخدوم امین فہیم ایوان میں تشریف لائے تو سوال وجواب کا سیشن شروع ہوا۔

سینیٹ سے وزیروں کی عدم موجودگی

جناب چیئرمین! میں اپنے دونوں سینیٹر بھائیوں کے ساتھ آپ سے بڑی دردمندی کے ساتھ یہ اپیل کرنا چاہتا ہوں کہ اس ایوان کے تقدس اور اس کے حقوق کی پامال کرنے کی کوئی حد ہونی چاہیے۔ تحریکِ التواء اور سوالات کے وقفہ دونوں کے لیے وزراء کا ہونا ضروری ہے[1]۔ ماضی میں وزراء کے لاپروائی کے اسی طرز عمل کو دیکھتے ہوئے ۱۸ویں ترمیم میں دستوری پابندی یہ رکھی گئی ہے کہ کابینہ انفرادی و اجتماعی طور پر جس طرح قومی اسمبلی کو جوابدہ ہے اسی طرح سینیٹ کو بھی جوابدہ ہے۔ لیکن مجھے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ ۱۸ویں ترمیم کے بعد بھی وزراء کے طرز عمل میں کوئی فرق نہیں پڑا ہے۔ آج آپ کو معلوم ہے کہ صرف تین وزارتوں کے سوالات تھے ہم ساری کابینہ کا مطالبہ نہیں کر رہے ہیں۔ ان کو یہ چیز معلوم تھی کہ ان کے سوالات آرہے ہیں لیکن وہ اس کے باوجود یہاں نہیں آئے۔

آپ کو معلوم ہے کہ تحریکِ التواء کے بارے میں متعلقہ وزیر کو پہلے سے بتادیا جاتا ہے کہ آج تحریکِ التواء آرہی ہے، اس کے باوجود ان کا نہ آنا، یہ صریحاً سینیٹ کے خلاف جارحانہ رویہ ہے۔ جناب چیئرمین! میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کا سنجیدگی سے نوٹس لیں، ورنہ ہم مجبور ہوں گے کہ ہم پوری کارروائی کا بائیکاٹ کریں۔ ہم نہیں چاہتے کہ یہ راستہ اختیار کیا جائے لیکن ہمیں اس کے لیے مجبور کیا جارہا ہے۔ میں آپ سے عرض کروں گا کہ یا آپ اس معاملے میں فوراً ایکشن لیں ورنہ پھر ہم مجبور ہوں گے اور جو انتہائی اقدام ہوگا وہ ہم اٹھائیں گے۔

(۲نومبر ۲۰۱۱ء)

---

[1] سینیٹر پروفیسر خورشید احمد اور دیگر سینیٹروں نے پٹرولیم کی مصنوعات کی قیمتوں میں اوگرا کی جانب سے چھ روپے اضافہ کی سمری منظوری کیے جانے پر سینیٹ میں تحریکِ التواء پیش کی تھی لیکن تحریک پر بحث شروع کرانے کے وقت ایوان میں کافی دیر تک کوئی وزیر نہیں آیا جس پر کئی سینیٹروں نے چیئرمین سینیٹ کو تجویز کیا کہ وہ وزراء کی جانب سے سینیٹ کے استحقاق کے پامال کیے جانے پر سزا کی رولنگ دیں۔ اس دوران وزیر پٹرولیم ڈاکٹر عاصم حسین ایوان میں تشریف لے آئے جس کے بعد اس تحریک پر بحث شروع ہوگئی۔

باب نمبر ۱۰

چیئرمین سینیٹ (یا اسپیکر) کا کردار

- ۱ -

(گرفتار رکن کی پارلیمنٹ میں حاضری)

زیرِ نظر تقریر سینیٹ میں یکم جنوری ۱۹۹۵ء کو اس موقع پر کی گئی جب پیپلز پارٹی کی حکومت نے سینیٹر چوہدری شجاعت حسین کو سیاسی بنیادوں پر نظر بند کر دیا اور اس سبب وہ سینیٹ کے اجلاس میں شرکت نہ کر سکے۔ سینیٹ میں معاملہ اٹھائے جانے پر چیئرمین سینیٹ نے چوہدری شجاعت کے پروڈکشن آرڈر جاری کیے لیکن حکومت نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ ان کا مقدمہ عدالت میں زیرِ سماعت ہے اس لیے وہ چیئرمین سینیٹ کی رولنگ کا احترام کرنے کے باوجود انھیں ایوان میں نہیں لا سکتے۔ ایوان سے حاضری کے لیے عدالتی حکم ضروری ہے۔

جناب چیئرمین! سب سے پہلے میں یہ بات دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ چوہدری شجاعت حسین صاحب ایوان میں اس وقت کیوں موجود نہیں ہیں؟ جس بنیاد پر چوہدری شجاعت حسین صاحب کو ایوان میں لانے کا مسئلہ اٹھایا گیا تھا اور جس میں چیئرمین کی رولنگ، اس کا احترام، اس پر عملدرآمد نیز اس ایوان کے استحقاق کو سامنے رکھ کر انھیں یہاں لانے کی بات کہی گئی تھی وہ بہت واضح تھی۔ ڈپٹی چیئرمین نے اس دن ایوان کو بھی اسی بنیاد پر ملتوی کیا تھا کہ چوہدری صاحب کو آج لازماً ایوان میں لایا جائے گا لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ چوہدری صاحب ایوان میں نہیں ہیں۔

جنابِ والا! میں چاہوں گا کہ آپ سے یہ بات معلوم کروں کہ کیا حکومت ان کو

ایوان میں لا رہی ہے یا نہیں۔ اگر نہیں لا رہی تو آپ ہمیں اس پر بات کا موقع دیں۔

اس سے قبل بھی ہم نے یہ بات کہی تھی اور آج بھی دہرانا چاہیں گے کہ ہمارے لیے سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ آیا اس ملک میں پارلیمنٹ خود مختار ہے یا نہیں۔ کیا یہ ایوان اپنے معاملات کو طے کر سکتا ہے اور کیا چیئرمین کی رولنگ کا احترام کیا جائے گا یا نہیں۔ ہمیں بتایا جائے کہ اس ایوان کی کیا حیثیت ہے۔ اگر یہ ایوان اپنے معاملات کے اندر خود مختار نہیں ہے، اگر اس کے چیئرمین کی رولنگ کو حکومت جس طرح چاہے لٹکائے تو پھر حقیقت یہ ہے کہ پارلیمنٹ اور سیاسی عمل کا اس ملک میں آگے بڑھنا بہت مشکل ہے۔ اس لیے جنابِ والا! میں جاننا چاہوں گا کہ چوہدری صاحب کو لانے کے سلسلہ میں چیئرمین کی رولنگ پر عمل ہوا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو آپ مجھے اس بات کا موقع دیں کہ میں اس پر زور دوں کہ قانون اور دستور، ہر ایک کا تقاضا یہ ہے کہ کسی بھی دوسرے موضوع پر آگے بڑھنے سے پہلے اس مسئلے کے بارے میں ہم یکسو ہوں۔

جنابِ والا! پھر مجھے اس پر بات کرنے کا موقع دیجیے کہ اس طرزِ عمل کے کیا اثرات ہیں۔ جناب چیئرمین! میرے خیال سے رضا ربانی صاحب نے گول مول انداز میں بات کی ہے لیکن جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں اس کا لبِ لباب یہ ہے کہ چیئرمین کی رولنگ ہمیں پابند نہیں کرتی ہے۔ ہم ان کو پہلے بھی چیئرمین کی رولنگ کے تحت ایوان میں نہیں لائے تھے بلکہ عدالتی حکم کی بنا پر لائے تھے۔ چنانچہ اس سے پہلے جمعرات کو بھی اور آج بھی چیئرمین کی رولنگ کو ہم نے کوئی وقعت نہیں دی ہے۔

جنابِ والا! میں چاہتا ہوں کہ اس معاملے کے مختلف پہلو بہت اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے رکھوں۔ درحقیقت یہ ایک بڑا سنجیدہ مسئلہ ہے۔ یہ اس طرح کا معمولی معاملہ نہیں ہے جس طرح سے اس کو سرسری طور پر پیش کیا جا رہا ہے دوسری جانب نہ یہ کسی کی ناک کا اور نہ ہی انا کا مسئلہ ہے، نہ اپوزیشن کے لیے نہ حکومت کے لیے۔ اس ایوان کا تقدس، اس ایوان کا مقام اور اس ایوان کے اراکین کو اس لائق رکھنا کہ وہ اپنی ذمہ داری ادا کر سکیں

ریاست کے تمام اداروں اور حکومت کا فرض ہے۔ اگر ملک کا نظام یہ کام نہیں کر سکتا تو پھر یہاں جمہوریت نہیں چل سکتی۔ اس لیے میں آپ سے صاف کہنا چاہتا ہوں کہ اس ایوان کا، دستور پر عمل کا اور جمہوری عمل کے تسلسل کا انحصار اس مسئلے کے اوپر ہے۔

اسی تناظر میں سب سے پہلے میں آپ کی توجہ اس طرف دلاؤں گا کہ ایوان کی توہین ہے کیا چیز؟ اس ضمن میں درج ذیل اقتباس پر غور کیجیے:

> ”عام طور پر کوئی بھی ایسی بھول چوک جو پارلیمنٹ کے کسی بھی ایوان کے کاموں کی انجام دہی میں مزاحمت یا رکاوٹ کا باعث بنتی ہے یا جو ایوان کے کسی رکن یا افسر کو اس کے فرائض کی انجام دہی میں مانع یا رکاوٹ پیدا کرتی ہے یا جو براہ راست یا بالواسطہ طور پر ایسے نتائج پیدا کر سکتی ہو اسے ایوان کی توہین سمجھا جائے گا چاہے ایسے جرم کی پہلے سے کوئی نظیر موجود نہ ہو“۔[1]

جنابِ والا! مرکزی نکتہ یہ ہے کہ ہاؤس کے ارکان کو اگر ہاؤس میں آنے سے روکا جائے، خواہ جسمانی طور پر یا پریشان کر کے، رشوت دے کر یا دباؤ کے کسی اور ذریعے سے تو اس کی اجازت نہیں ہے۔ ایک رکن کو جو جائز طور پر ہاؤس میں آنا چاہے اگر اسے ہاؤس میں آنے سے ان میں سے کسی بھی وجہ سے روکا جاتا ہے تو یہ ہاؤس کی توہین ہے۔ یوں یہ صرف اس فرد کے استحقاق کا معاملہ نہیں ہے پورے ہاؤس کے استحقاق کا معاملہ ہے۔ میری دلیل تین بنیادوں پر ہے: پہلی اس ممبر کا استحقاق، دوسرا اس ایوان کا استحقاق اور تیسرا یہ کہ چیئرمین کی رولنگ کی حیثیت۔ رولنگ صحیح ہو یا کسی کی نگاہ میں قابلِ اعتراض ہو لیکن جب ایک رولنگ آجاتی ہے تو اس رولنگ کے بعد پھر اس کے تقاضے ہیں۔ یہ تین نکات ہیں جو میں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے آپ یہ دیکھیے کہ دستور نے اراکینِ پارلیمنٹ کے جو

---

[1] (Erskine May، پارلیمنٹری پریکٹس باب نمبر ۹ ص ۱۱۵)

استحقاق دیے ہیں اس کے اندر دو چیزیں واضح ہیں۔ ایک آزادی تقریر اور دوسری یہ کہ قانون کے تحت جو بھی استحقاق مرتب کیے جائیں ان کا ہر رکن کو استحقاق حاصل ہو گا۔ یہ بھی واضح ہے کہ جب تک قانون نہیں بنتا تو وہ صورتِ حال، جو قیامِ پاکستان کے وقت موجود تھی جو معروف پارلیمانی روایت ہے، استحقاق تصور کی جائے گی۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے آزادئ تقریر کے لیے اجلاس میں شرکت کی آزادی لازم ہے۔ تقریر اسی وقت ممکن ہے جب ایک فرد ہاؤس کے اندر ہو۔ اگر کوئی رکن ہاؤس کے اندر موجود نہ ہو تو نہ وہ بول سکتا ہے نہ اس کی آواز ہم سن سکتے ہیں۔ وہ اپنی بات پیش ہی نہیں کر سکتا ہے۔ تو میں یہ عرض کروں گا کہ خود آئین نے یہ بنیادی بات کہی ہے۔ درحقیقت آزادئ تقریر کے اندر یہ بات پوری طرح سے پنہاں ہے، یہ اس کے اندر شامل ہے اور اسے دستور نے واضح طور پر ایک استحقاق قرار دیا ہے۔

جنابِ والا! اس کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ قانون میں کچھ ایسی گنجائشیں موجود ہیں کہ جن کی بنیاد پر ایک ممبر کو ایوان میں لانے سے روکا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایک صورت یہ ہے کہ متعلقہ رکن گرفتار ہو۔ لیکن یہاں پر قانون نے تین اقسام مقرر کی ہیں۔ ایک شہری مقدمات، دوسرا جرائم پر مبنی مقدمات، تیسرے مدافعتی مقدمات..... ان تینوں میں سے ہر ایک کا الگ الگ معاملہ کیا گیا ہے۔ دوسری جانب ان تینوں صورتوں کے ساتھ چوتھی قسم بھی ہے جو ان تینوں میں شمار نہیں ہوتی اور یہ قسم وہ ہے جس میں رول ۷۲-اے کے تحت چیئرمین اپنی صوابدید کو استعمال کرتے ہوئے کسی رکن کو ایوان میں بلوا سکتا ہے:

> اگر وہ (چیئرمین / اسپیکر) کسی بھی ایسے شخص کی (جو کسی بھی وجہ سے جیل میں ہو یا اس کا جیل میں رکھنا ضروری ہو) ایوان میں موجودگی ضروری سمجھتا ہے تو وہ اس کی ایوان میں موجودگی کا مطالبہ کر سکتا ہے۔

اس صورت میں مقدمات کی وہ تینوں نوعیتیں یعنی مدافعتی مقدمات اور دیوانی اور

فوجداری مسائل پر مبنی مقدمات کی بحث غیر متعلق ہو جاتی ہے۔ چیئرمین کی رولنگ کے تحت رکن کی موجودگی یہاں ضروری ہو جاتی ہے۔ اس سیاق میں کچھ مقدمات بھی ہمارے سامنے آتے ہیں جو بہت ہی اہم ہیں۔ میں خاص طور پر آپ کی توجہ May میں بیان کی گئی درج ذیل بات کی طرف مبذول کراؤں گا۔

> وہ (چیئرمین / اسپیکر) استحقاق کے معاملے پر کسی شخص کی ایوان میں حاضری کو یقینی بنانے اور حدود سے تجاوز کرنے والے کسی شخص کو حراست میں بھیجنے کا اختیار رکھتا ہے[1]۔

اس کے بعد وہ اتر پردیش کے کیس کا حوالہ دیتے ہیں، جس میں ایک ایڈیٹر کو طلب کیا گیا، جسے نظر بند کیا گیا تھا۔ وہ ایڈیٹر ہاؤس کا ممبر نہیں تھا لیکن اس کی گواہی اسپیکر کی نگاہ میں ضروری تھی۔ اس کے بارے میں سپیکر نے رولنگ دی کہ اسے حاضر کیا جائے، کورٹ سے لایا جائے تاکہ وہ گواہی دے سکے۔ تاہم جب اسے گواہی کے لیے ایوان میں نہیں لایا گیا تو سپیکر نے اس کو ایوان کی توہین شمار کیا۔ یہ کیس پھر عدالت میں گیا اور عدالت نے بھی اس کی تائید کی کہ اگر اسپیکر نے کسی شخص کو، خواہ وہ حکومتی تحویل میں ہو، خواہ وہ سزایافتہ ہو، بلایا ہے تو اس کو ایوان میں لانا ضروری ہے۔ دوسرے الفاظ میں، میرا استدلال یہ ہے کہ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ گرفتار ہونے والے کو جائز پکڑا گیا ہے یا ناجائز پکڑا گیا ہے یا اس کی گرفتاری کی کوئی بنیاد نہیں ہے اور کوئی چیز بھی اس کے بارے میں ابھی ثابت نہیں۔

اسی لیے ان سب باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے میں صرف اتنی بات کہتا ہوں کہ ہاؤس کا یہ حق ہے کہ چیئرمین یا اسپیکر کسی شخص کو، خواہ وہ کسی بھی بنیاد پر سرکاری تحویل میں ہو اور خواہ وہ سزایافتہ ہو، اگر وہ سمجھتے ہیں کہ اس کی موجودگی ہاؤس میں ضروری ہے تو وہ اسے طلب کر سکتے ہیں اور، جب ایک بار فیصلہ ہو جائے، اس کے بعد ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کو

---

[1] Erskine May، پارلیمنٹری پریکٹس صفحہ ۲۲۷

لازماً ایوان میں پیش کیا جائے۔ اس بات کو پارلیمنٹ اور عدالت دونوں نے برقرار رکھا ہے۔

جنابِ والا! اس کے بعد میں یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ یہ جو سارا تصور گرفتاری کے بارے میں پیدا ہوا ہے، کہ کسی شخص کو پارلیمنٹ کے سیشن سے پہلے گرفتار نہ کیا جائے، اس کو آپ نظر انداز نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص ممبر ہے، اس کی سیٹ خالی نہیں ہوئی ہے اور اس کی موجودگی کو ضروری سمجھا گیا ہے تو اس کو ہاؤس میں آنا چاہیے۔ اس کو ہاؤس کے اندر آنے سے روکنا ایوان کی توہین ہے۔ جنابِ والا! میں چیئرمین کی ہر رولنگ کو ماننے کے بارے میں بھی چاہوں گا کہ آپ کے سامنے کم از کم ایک چیز رکھ دوں۔ میں صرف May کی طرف آتا ہوں۔ اس سے پہلے میں نے صفحہ ۱۱۵ سے آپ کو ایک اقتباس پڑھ کر سنایا ہے۔ اب دوسری چیز میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

اس کے مطابق اگر چیئرمین کے کسی حکم کے بارے میں، خواہ یہ کہا جائے کہ ہم اس کا احترام کرتے ہیں لیکن ہم اس کو مانتے نہیں، ہم اس پر عمل نہیں کرتے تو میری نگاہ میں جنابِ والا! یہ بھی ایوان کی توہین ہے۔ اس لیے کہ چیئرمین کا آرڈر محض تعریف اور زبانی جمع خرچ کرنے کے لیے نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ عملدرآمد کے لیے ہوتا ہے۔ اور سوال یہ ہے کہ اگر اس کا نفاذ نہیں کیا جا رہا ہے تو کیا یہ ہاؤس کی توہین اور چیئرمین کی حکم عدولی نہیں ہے۔ ایوان کا اختیار ہے کہ وہ ایسے حالات کے اندر ان افراد کو سزا بھی دے سکتا ہے جو ہاؤس کے ان احکامات کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ اس سلسلے میں، میں آپ کو حوالہ بھی دے دیتا ہوں۔ صفحہ ۲۴۵ پر یہ نافرمانی کے عنوان سے ہے۔ میں پڑھ رہا ہوں:

> ایوان کے احکامات کی نافرمانی ایوان کی ہوگی، خواہ یہ احکامات عمومی امور سے متعلق ہوں یا کسی خاص فرد کو کسی خاص کام سے باز رکھنے سے متعلق ہوں۔ ایوان کی کسی کمیٹی کے احکامات کی نافرمانی بھی ایوان کی توہین ہی سمجھی جائے گی بشرطیکہ وہ احکامات جن کی نافرمانی کی گئی با اختیار حاکم / افسر کے دائرہ اختیار میں آتے ہوں۔

ایوان یا اس کی کمیٹی کے احکامات پر عمل درآمد میں تاخیر کرنا، رکاوٹ ڈالنا یا مداخلت کرنا بھی ایوان کی توہین سمجھا جائے گا۔

اس کے بعد اس کی جو مثالیں دی گئی ہیں ان میں کسی فرد کو روکنا، کسی حکم کو نہ ماننا، کسی دستاویز کو پیش نہ کرنا جیسی مثالیں بھی شامل ہیں۔ اب اگر دستاویز کو پیش نہ کرنا بھی ایوان کی توہین ہے۔ تو ممبر کو ہاؤس میں نہ لانا تو بہت بڑی توہین ہے۔

جنابِ والا! اس بحث کی روشنی میں میرا استدلال ہے کہ چوہدری شجاعت حسین ہاؤس کے ممبر ہیں اور انھیں یہاں لانے کے لیے چیئرمین نے رولنگ دی ہے۔ چنانچہ ان کو یہاں نہ لانا ہاؤس کی توہین اور متعلقہ ممبر کے استحقاق کی راست خلاف ورزی ہے۔

جنابِ والا! اس کے ساتھ ہاؤس کے مکمل ہونے یا نامکمل ہونے پر ایک بڑے ہی عجیب سے انداز میں یہاں بحث کی گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کو واضح کروں۔ بلاشبہ ہاؤس مکمل ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہاؤس کے تمام ارکان لازماً موجود ہوں۔ یہ بات بھی درست ہے کہ اگر کورم موجود ہے تو ہاؤس اپنا کام کر سکتا ہے۔ لیکن اصل ایشو یہ ہے ہی نہیں۔ اصل ایشو یہ ہے اگر ایک ممبر اپنی مرضی سے یہاں آنا چاہتا ہے اور چیئرمین اس کی موجودگی کو ہاؤس کے لیے ضروری سمجھتا ہے اور ملک کا قانون یا ملک کی حکومت یا کوئی ادارہ اس کی شرکت کو روکے تو ایسی صورت میں فی الحقیقت ہاوس نامکمل رہتا ہے۔ اگر مجھے یہاں سے کوئی زبردستی اٹھا کر لے جائے جبکہ میں یہاں موجود ہونا چاہتا ہوں، اور صدر مجلس چاہتے ہیں کہ میں یہاں رہوں لیکن مجھے کوئی جسمانی طور پر اٹھا کر لے جاتا ہے تو یہ ایوان کی توہین ہے۔ ایسے میں ایوان اس وقت تک نامکمل رہے گا جب تک میں ایوان میں واپس نہیں آجاتا۔ جنابِ والا! ایوان کا مکمل اور نامکمل ہونا حاضر ارکان کی تعداد کا مسئلہ نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ کسی بھی کام کو انجام دینے کے لیے اگر کسی کی موجودگی ضروری ہے تو پھر اس کو روکنا درحقیقت مداخلت ہے اور دراصل ہاؤس کو نامکمل بنا دیتا ہے۔

یہاں جنابِ والا! میں حکومت کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں اور بالخصوص وزیر اعظم صاحبہ کو بھی مخاطب کر کے کہنا چاہتا ہوں کہ اس مسئلے پر پارٹی کی بنیاد پر غور نہ کریں بلکہ ایوان کی بنیاد پر غور کریں۔ میں آپ کے سامنے مثال دینا چاہتا ہوں کہ اصل میں اصول کیا ہے۔

کیا کوئی اصول ہو سکتا ہے کہ جو بھی حکومت وقت ہو اسے یہ اختیار حاصل ہو جائے کہ جب چاہے وہ کچھ ارکان کو کسی مقدمے میں پھنسا کر یا کسی اور بنا پر گرفتار کر لے اور ہاؤس میں آنے سے روک دے۔ اگر چیئرمین، اسپیکر یا، دوسرے الفاظ میں، ہاؤس ضروری سمجھتا ہو کہ وہ ارکان ہاؤس میں آئیں تب بھی حکومت یہ کہے کہ نہیں یہ ہماری ذمہ داری نہیں ہے کہ ہم ان کو یہاں پر لائیں۔ آپ عدالت سے رجوع کریں یا وہ خود ضمانت لیں یا جو چاہیں آپ کریں۔

نہیں جنابِ والا! یہ اصول نہیں ہو سکتا۔ یہ ہونے لگے تو جنابِ والا! کسی بھی فیصلہ کن ووٹ کے موقع پر جب حکومت کا وجود یا اس کا عدم ہو جانا منحصر کرتا ہے حکومتیں یہی طرزِ عمل اختیار کریں گی کہ ایسے موقع کے اوپر اپوزیشن کے چند ارکان کو گرفتار کر لیں اور ہاؤس میں نہیں آنے دیں تاکہ اس کے نتیجے کے طور پر وہ ووٹ متاثر ہو جائے۔ مثلاً عدم اعتماد کی تحریک کے موقع پر تعداد کا معاملہ ہے۔ اس موقع پر حکومت اگر چار، پانچ، چھ افراد کو اغواء کر لیتی ہے اور ہاؤس کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنے ممبرز کو واپس لا سکے جبکہ حکومت یہی کہے کہ ہم تہی دست ہیں بے اختیار ہیں۔ ہم خطرہ نہیں لے سکتے، عدالت کے پاس جاؤ یا جہاں چاہے حل تلاش کرو۔ تو جنابِ والا! اس طرح تو دراصل ملک کے پورے سیاسی نظام کو تہہ و بالا کیا جا سکتا ہے۔ آپ کو یاد رہنا چاہیے کہ آج آپ وہاں ہیں تو کل یہاں غیر حکومتی بنچوں پر ہوں گے۔ حکومت کسی کی بھی ہو اسے دائمی اصولوں کی بنیاد پر فیصلے کرنے چاہئیں۔

جنابِ والا! اس ہاؤس کو اس پر مؤقف اختیار کرنا چاہیے۔ درحقیقت جب تک چیئرمین کی رولنگ پر عمل نہیں ہوتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس ہاؤس کا کام کرنا بالکل بے معنی اور غیر ضروری ہے۔ (یکم جنوری ۱۹۹۵ء)

- ۲ -

قواعد کی معطلی کی روایت

پیپلز پارٹی کی حکومت نے ۱۲نومبر ۲۰۱۰ء کو قومی اسمبلی میں فنانس ترمیمی بل ۲۰۱۰ء جو ایکسائز ڈیوٹی دگنی کرنے سے متعلق تھا اور جنرل سیلز ٹیکس بل (اصلاح شدہ ۲۰۱۰ء) پیش کیا جسے اسی دن سینیٹ آف پاکستان کو غور کر کے سفارشات دینے کے لیے بھجوا دیا گیا۔ جنرل سیلز ٹیکس بل کے بارے میں وزیرِ خزانہ عبد الحفیظ شیخ نے بتایا کہ ہماری معیشت اس وقت آئی ایم ایف پروگرام سے منسلک ہے ہم نے گیارہ ارب ڈالر قرضہ لینے کا آئی ایم ایف سے معاہدہ کیا ہوا ہے۔ قرضہ دینے والا کیونکہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ ہم یہ قرض انھیں کس طرح واپس کریں گے تو ہم جنرل سیلز ٹیکس اور فنانس ترمیمی بل ۲۰۱۰ء پارلیمنٹ سے منظوری کے بعد نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ توقع ہے کہ ان قوانین کے ذریعہ ٹیکس کے نفاذ سے اتنے وسائل جمع ہو جائیں گے کہ ہم آئی ایم ایف کا قرض واپس کرنے کے قابل ہو جائیں۔

سینیٹ میں مندرجہ بالا دونوں بلوں پر ابتدائی گفتگو کے بعد انھیں فنانس اسٹینڈنگ کمیٹی میں بھیج دیا گیا۔ جس پر کمیٹی نے غور کرنے کے بعد ۲۶نومبر کو اپنی رپورٹ سینیٹ کے اجلاس میں پیش کر دی۔ سینیٹ میں اپوزیشن لیڈر سینیٹر وسیم سجاد اور پروفیسر خورشید احمد نے ایک قرارداد پیش کی جس میں کہا گیا تھا کہ سینیٹ آف پاکستان جنرل سیلز ٹیکس بل اور فنانس ترمیمی بل کو مسترد کرتی ہے اور قومی اسمبلی سے بھی درخواست کرتی ہے کہ وہ ان بلوں کو مسترد کر دے۔ اس قرارداد کو سینیٹ کے اجلاس میں فوری طور پر زیرِ بحث لانے کے لیے انھوں نے چیئرمین سینیٹ سے قواعد کی معطلی کی بھی درخواست کی۔

قواعد کی معطلی: جناب چیئرمین! اس ایوان کا اپنا ایک وقار ہے اور میں اپنی گزارشات پیش کرنے سے پہلے درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ ہم سب کو اس کا احترام کرنا چاہیے۔ اختلاف ہمارا حق ہے لیکن یہ قواعد کے مطابق ہی ہونا چاہیے۔ اور جہاں کہیں کوئی بات قواعد کے سلسلے

میں اٹھائی جائے ہمارا فرض ہے کہ ہم ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں۔ درحقیقت قواعد میں اس بات کی پوری گنجائش موجود ہے کہ ایوان کی اکثریت جو چاہتی ہے وہ آگے بڑھایا جائے اس لیے ہمیں ٹھنڈے دل سے ایسا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

دوسری بات اس قانونی نکتہ[1] سے متعلق ہے جو وسیم سجاد صاحب نے اٹھایا ہے۔ میں اس کی تائید کرتے ہوئے تھوڑا سا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ میرا پہلا اضافہ یہ ہے کہ بلاشبہ چیئرمین کو صوابدید حاصل ہے اور میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ بالعموم چیئرمین نے اس صوابدید کو اعتدال اور توازن کے ساتھ اور ایوان کی مرضی کے مطابق استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ بلاشبہ ایسی کوشش ہونی چاہیے اور میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ بات واضح طور پر سامنے رہنی چاہیے۔ ایوان کے ناظم اور ان قواعد کے امین ہونے کی حیثیت سے یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ اس ایوان کی اکثریت کی جو رائے ہے اس کو آپ جاننے کی کوشش کریں اور اس کا احترام بھی کریں۔ البتہ کوئی چیز جو آئین کے خلاف ہو قابلِ احترام نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ آئین کے مقابلہ میں یہ قواعد بالادست نہیں ہیں لیکن آئین کے تحت یہ قواعد حاوی ہیں۔

یہاں میں اس بارے میں بھی آپ کو متوجہ کروں گا کہ قواعد میں رکھی گئی باتیں بڑی اہم ہیں اور ان پر عمل بھی کیا جاتا رہا ہے۔ تاہم اگر کہیں ہم قواعد کے لگے بندھے ضابطے کی پابندی نہیں کر پاتے ہیں تو قواعد کی معطلی ایک معروف طریقہ ہے۔ ہم نے ہر سیشن میں ایک بار یا کئی بار ایسا کیا ہے۔ اس کی بناء پر قرار دادیں بھی آئی ہیں۔ قواعد کی معطلی کے معاملہ کو مثبت طور پر دیکھنا چاہیے کہ معطلی کرنے یا نہ کرنے میں حقیقی مفاد کیا ہے۔ اسی بنا پر میں

---

[1] سینیٹر وسیم سجاد صاحب نے اس قانونی نکتہ کی وضاحت کی کہ چونکہ یہ مالیاتی بل ہیں اس لیے سینیٹ اس پر صرف سفارشات قومی اسمبلی کو بھجوا سکتی ہے۔ اب یہ قومی اسمبلی کا دائرہ کار ہے کہ وہ ان سفارشات میں سے کتنی سفارشات کو قبول یا مسترد کرتی ہے۔

سمجھتا ہوں کہ جنرل سیلز ٹیکس بل کو مسترد کرنے کی جو قرارداد[1] جناب وسیم سجاد نے پیش کی ہے، میں نے اس کی تائید کرتے ہوئے اس پر بھی دستخط کیے ہیں اور میرے خیال میں یہ وقت کی ضرورت ہے اور اسے آنا چاہیے۔ یہ تو اس معاملہ کا خالص قانونی پہلو ہے۔

لیکن قانونی معاملے کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں اور میں یہ بات پریس میں بھی کہہ رہا ہوں، ہاؤس میں بھی کہہ رہا ہوں اور میڈیا میں بھی کہ ہمیں یہ پیکیج (جنرل سیلز ٹیکس بل)، جو اس وقت ان دو قوانین (جنرل سیلز ٹیکس بل ۲۰۱۰ء اور فنانس ترمیمی بل ۲۰۱۰ء) کی شکل میں لایا گیا ہے، ہرگز قبول نہیں ہے۔ میں نے اس سے پہلے کسی مرحلے پر اسے قبول نہیں کیا ہے اور میں اس کو ثابت کر سکتا ہوں۔ اس ضمن میں میری پہلی تحریری رپورٹ بھی موجود ہے اسی لیے میری درخواست ہے کہ ان چیزوں پر غور کیا جائے۔ (اس رپورٹ میں پہلا نکتہ ہی یہ تھا کہ سینیٹ کمیٹی نے پچھلے سال سفارش کی تھی کہ جنرل سیلز ٹیکس کو ایک سال کے لیے مؤخر کیا جائے اور اس کی شرح ساڑھے بارہ فیصد پر لائی جائے۔)

میں نے یہ بات آن ریکارڈ کہی ہے اور میرا جو اختلافی نوٹ ہے اس میں بھی یہ بات شامل ہے کہ ہم نے ان سفارشات کو محض جزوی اصلاحات کے نقطۂ نظر سے لیا ہے، اپنی اصل پوزیشن پر سمجھوتہ کیے بغیر۔ اور وہ پوزیشن یہ ہے کہ یہ دونوں سفارشات ہمارے لیے قابلِ قبول نہیں ہیں۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ جناب وسیم سجاد کی تجویز صحیح ہے اور آپ کو آگے بڑھنے سے پہلے ایوان سے دریافت کرنا چاہیے کہ کیا ایوان اس کے حق میں ہے یا نہیں؟

جنابِ والا! آپ کے توسط سے میں ایوان کے تمام ارکان سے یہ کہوں گا کہ دیکھیے

---

[1] آئین کے مطابق زیر بحث دونوں بل سینیٹ میں غور کرنے اور اپنی سفارشات چودہ دن کے اندر قومی اسمبلی کو بھجوانے کے لیے پیش کیے گئے۔ قواعد کے مطابق دونوں بل سینیٹ کی فنانس کمیٹی میں تفصیلی جائزہ کے لیے بھیج دیے گئے۔ کمیٹی نے بلوں کا جائزہ، ترمیم واضافے کے لیے سفارشات مرتب کیں لیکن اس دوران پورے ملک میں بھرپور عوامی ردعمل کو سامنے رکھتے ہوئے جناب وسیم سجاد نے سینیٹ میں ایک قرارداد پیش کی کہ سینیٹ اس بل کو مسترد کرتی ہے اور قومی اسمبلی سے بھی درخواست کرتی ہے کہ وہ ان بلوں کو مسترد کر دے۔

اب رپورٹ[1] پیش ہو گئی ہے اور یہ اب ہماری ملکیت بن گئی ہے۔ اب ہمارے پاس صرف دو ہی راستے ہیں۔ یا تو ہم اس رپورٹ کو منظور کر کے بھیجیں یا ہم اسے مسترد کر دیں۔

میری اور میری جماعت کی پوزیشن تو یہ ہے۔ جس طرح سے سینیٹر بابر اعوان نے کہا اسی طریقے سے صرف وہ نہیں ہیں اس میں، میں بھی شامل ہوں اور سب سے لمبا نوٹ اس میں میرا ہے، پھر اس میں سینیٹر ہارون اختر کا نوٹ ہے، سینیٹر اسحاق ڈار کا نوٹ ہے اور سینیٹر احمد علی کا نوٹ ہے اور یہ اس رپورٹ کا حصہ ہیں۔ اصولاً ان نوٹس کو بھی منظور کیا جانا چاہیے۔ ماضی میں یہ طریقہ رہا ہے کہ جو اقلیتی رپورٹ ہوا کرتی تھی وہ الگ آتی تھی اور اس پر الگ ووٹ لیے جاتے تھے لیکن چونکہ وہ بجٹ کا طریقہ تھا اس لیے ہم نے یہاں پیش نہیں کیا۔

میں واضح طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ (فنانس ترمیمی بل پر) جو سفارشات آئی ہیں، ہم نے اس مکمل پیکیج کو اور اسی طرح دونوں بلوں (جنرل سیلز ٹیکس بل ۲۰۱۰ء اور فنانس ترمیمی بل ۲۰۱۰ء) کو مسترد کیا ہے۔ وہ اس لیے کیا ہے کہ اگر آپ اس میں کوئی بہتری کرنا چاہتے ہیں تو کر لیں۔ میں صاف طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ موجودہ شکل میں اگر آپ کے پاس کوئی متبادل نہیں ہے تو آپ کو لازماً اس رپورٹ کو ایوان میں ووٹنگ کے لیے پیش کرنا چاہیے۔ ایوان کی صوابدید ہو گی کہ یہ رپورٹ مسترد کرے یا قبول کرلے اور ہم اس کو مسترد کریں گے۔

جناب چیئرمین! آپ کی اجازت سے عرض کروں گا کہ بلاشبہ سینیٹر بابر اعوان نے آئین کا ٹھیک حوالہ دیا ہے۔ ہمارا اختیار مسترد یا قبول کرنا نہیں ہے ہم صرف سفارش کر سکتے ہیں یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔ اب تک دو سال میں ہم نے جو روایت قائم کی تھی وہ یہ تھی کہ جن باتوں پر سمجھوتہ ہو جاتا تھا، انہیں ہم متفقہ سفارشات کہتے تھے۔ جن پر اتفاق نہیں ہوتا تھا ان پر ہم کٹوتی کی تحریک کی شکل میں تجویز لاتے تھے۔ وہ یہاں مسترد ہو جاتی تھی، ریکارڈ پورا ہو جاتا

---

[1] سینیٹ آف پاکستان کی فنانس کمیٹی نے جنرل سیلز ٹیکس بل اور فنانس ترمیمی بل کا جائزہ لینے کے بعد جائزہ رپورٹ میں پندرہ نکاتی سفارشات پیش کی تھیں لیکن اس رپورٹ سے ہٹ کر کمیٹی میں شامل تمام جماعتوں نے ان بلوں کو مسترد کر دیا۔

تھا۔ اس مرتبہ جو صورت حال بنی ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ ہم پورے پیکیج کو مسترد کر رہے ہیں۔ اس لیے ہم نے اپنے اختلافی نوٹ کے اندر دونوں بلوں کے بارے میں اپنے تحفظات کا اظہار کیا ہے۔ ہم نے یہ کہا ہے کہ ہم اس کی حمایت نہیں کر رہے۔ ان کی یہ بات درست ہے کہ کمیٹی نے جو ۱۵ سفارشات دی ہیں ان پر وہاں اتفاق رائے کچھ لو اور دو کی بنیاد پر ہو گیا تھا۔ لیکن جو پوزیشن آج ایوان میں ہے اور جو پوزیشن پورے ملک میں ہے اس میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر ہماری ان سفارشات کے معنی یہ ہیں کہ ہم بل کی حمایت کر رہے ہیں تو یہ غلط ہے۔ اسی لیے ہم اس پوری رپورٹ کو مسترد کرنے کے لیے تیار ہیں تاکہ سینیٹ کا یہ پیغام قومی اسمبلی کے سامنے اور قوم کے سامنے بھی پہنچے کہ وہ اس کی تائید نہیں کر رہے ہیں۔ (۲۶ نومبر ۲۰۱۰ء)

– ۳ –

زیرِ نظر تقریر جنرل پرویز مشرف کے مارشل لاء کے دور میں معطل شدہ سینیٹ کی بحالی اور نئے چیئرمین اور اراکین کے حلف کے موقع پر کی گئی ہے جس میں چیئرمین سینیٹ کی جانب سے لیگل فریم ورک آرڈر کی حمایت میں دیے گئے بیان پر گرفت کی گئی ہے جبکہ اپوزیشن کے اراکین نے واضح مؤقف لیا تھا کہ وہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء سے قبل ۱۹۷۳ء کے آئین کی پوزیشن کے تحت حلف لیں گے۔

چیئرمین اور اسپیکر کی غیر جانبداری

جناب چیئرمین! میں اس ایوان میں یہ پوائنٹ آف آرڈر یقین مانیں بڑے دکھ اور افسوس کے ساتھ اٹھا رہا ہوں۔ الحمدللہ میں نے بارہ سال اس ایوان میں شرکت کی ہے اور کبھی قواعد اور ضابطوں کے احترام کے سلسلہ میں جان بوجھ کر کوتاہی نہیں کی۔ لیکن مجھے اس بات سے خاصا دکھ ہوا کہ جس جذبے سے ہم نے موجودہ سینیٹ کا آغاز کیا ہے اس کے مقابلے میں آپ کی طرف سے اور سینیٹ سٹاف کی طرف سے بے دردی کے ساتھ ہماری تحریکوں کو قتل کیا جارہا ہے۔ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ جو مسائل فی الحقیقت قوم کے لیے اور اس ایوان کے لیے اہم ہیں ان کو بھی سرسری انداز میں واپس کیا جارہا ہے۔ میں یہ بات اس ایوان اور آپ سے توقع

رکھتے ہوئے کہہ رہا ہوں کہ آپ اس کا نوٹس لیں گے اور اصلاح احوال کریں گے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو اہم مقام دیا ہے۔ گو آپ پارلیمانی اعتبار سے ایک نئے کیریئر کا آغاز کر رہے ہیں۔ لیکن آپ کے شاندار ماضی سے ہمیں توقع ہے کہ آپ پارلیمانی روایات اور ایوان کے کردار کو ملحوظ رکھتے ہوئے زیادہ وسعت قلبی سے معاملات کا معائنہ کریں گے۔ میں آپ کو صرف دو مثالیں دے کر بتاتا ہوں۔ میں نے ایک سوال یہ اٹھایا کہ امیگریشن کے قوانین کا اطلاق امریکہ میں کس طرح کیا جا رہا ہے اور کتنے افراد متاثر ہوئے ہیں اور حکومت کیا کر رہی ہے۔ یہ سوال واپس کر دیا گیا ہے۔ میں نے سوال اٹھایا کہ آصف علی زرداری صاحب آٹھ سال سے جیل میں ہیں۔ دو سو ستر مرتبہ ان کو عدالت میں پیش کیا گیا ہے اور کیس کو pursue نہیں کیا گیا۔ ان کے جو بھی معاملات ہوں لیکن وہ ایک انسان ہیں۔ اس سینیٹ کے رکن رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آخر ایسا کیوں کیا جا رہا ہے؟ سوال واپس کر دیا گیا۔

جناب چیئرمین! میں آپ کا بڑا احترام کرتا ہوں لیکن آپ اب جس مقام پر ہیں وہ غیر جانبداری کا مقام ہے اور، اسپیکر ہو یا چیئرمین، اب آپ کسی پارٹی کے رکن نہیں رہے ہیں۔ لیکن آپ نے لیگل فریم ورک آرڈر ۲۰۰۲ء (ایل ایف او)[1] کے بارے میں ایک بیان دیا۔ اس پر میں نے تحریک استحقاق دی کہ یہ اس ایوان کے استحقاق کی خلاف وزی ہے۔ آپ کے علم میں ہے کہ اسمبلی میں اس قسم کی قرار داد پیش ہوئی اور زیرِ غور آئی ہے۔ نہ صرف زیرِ غور آئی بلکہ یہ طے ہوا ہے کہ جس وقت اس پر بحث ہو گی اس وقت اسپیکر صاحب صدارت نہیں کریں گے لیکن سینیٹ میں آپ نے اس کو مسترد کر دیا۔ یہ دراصل اس ایوان کے ضابطوں کی روایات کے خلاف ہے۔ اس لیے ہم اس پر نصیحت بھی کرتے ہیں لیکن نصیحت کے ساتھ ساتھ احتجاج کرتے ہیں کہ یہ طریقہ نظام کو چلانے کا نہیں ہے۔

---

[1] ۲۰۰۳ء میں سینیٹ کی بحالی، نئے چیئرمین اور ڈپٹی چیئرمین اور اراکین کے حلف اٹھاتے ہوئے حزب اختلاف نے لیگل فریم ورک آرڈر کے تحت حلف اٹھانے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء سے قبل والی پوزیشن پر ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت حلف اٹھایا جس پر چیئرمین سینیٹ کے بیان کو پروفیسر خورشید احمد نے سینیٹ کے استحقاق کی خلاف ورزی قرار دیا۔

اس نظام کو اگر چلنا ہے تو اس میں آپ کو غیر جانبداری کے ساتھ، حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف دونوں کا لحاظ کرنا ہو گا اور جو بھی مسائل اس ملک کے لیے اہم ہیں ان سب کو بلاامتیاز زیرِ غور لانا ہو گا۔ ورنہ پھر یہ ایوان اس خوش اسلوبی کے ساتھ نہیں چل سکے گا۔ اس لیے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس بات کو ایوان میں لاؤں، قوم کے سامنے لاؤں اور آپ سے اس بات کی درخواست کروں کہ خدا کے لیے جو روایات اسپیکر کی ہیں وہ آپ کی بھی ہونی چاہییں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اسپیکر کا ووٹ بھی نہیں ہوتا۔ صرف اس لیے کہ وہ غیر جانبدار ہو جاتا ہے۔ آپ کو اب اس غیر جانبداری کا مظاہرہ کرنا ہے۔ آپ اس ایوان کی آبرو کی علامت ہیں۔ ہم آپ سے وہی توقعات رکھتے ہیں جو شاید حزبِ اقتدار رکھتی ہو۔ اس لیے آپ دونوں کے درمیان انصاف کریں اور جو ہمارا حق ہے وہ ہمیں دیں اور جو ان کا حق ہے انہیں دیں۔

جناب چیئرمین ! میں ادب سے عرض کرنا چاہ رہا ہوں کہ دراصل کچھ پارلیمانی روایات اور آداب ہوتے ہیں اور ہمیں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ پارلیمنٹ کے فورم پر جہاں ایک مسئلہ پر ہم کسی خاص وقت میں توجہ مرتکز کر رہے ہیں وہاں جو بھی دیگر ایشوز اٹھتے ہیں ان کا نوٹس بھی لیا جاتا ہے۔ ہم پارلیمنٹ کے آداب کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہم نے علامتی واک آؤٹ کیا ہے، مستقل واک آؤٹ نہیں کیا تاکہ کارروئی بھی متاثر نہ ہونے پائے۔ اس لیے آپ یہ نہ سمجھیں کہ جو نئے حضرات آئے ہیں ان کو شاید پارلیمانی آداب کا پوری طرح علم نہیں ہے۔ اگر آپ ماضی کی روداد نکال کر دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ایک بار نہیں دس دس بار علامتی واک آؤٹ ہوئے ہیں اور اس سے چیزیں ڈسٹرب نہیں ہوتیں اور یہ بھی پارلیمانی روایات ہیں کہ ایسے حالات میں کورم کی نشاندہی نہیں کی جاتی اور اگر کورم کا معاملہ اٹھایا جائے تو گھنٹی بجتی ہے اور لوگ دوبارہ آجاتے ہیں۔ تو یہ آداب ہیں۔ آپ حضرات ماضی کی روداد پڑھیں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ ہم قواعد کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے معاملات کو لے کر چل رہے ہیں۔ ہم نہ اس سے انحراف کرنا چاہتے ہیں نہ کریں گے۔ آپ کو بھی قواعد اور روایات کی پاسداری کرنی چاہیے۔ (یکم اپریل ۲۰۰۳ء)

سینیٹ کی کارکردگی اور آئندہ کردار
(رکنیت کے ۲۱ سالہ تجربات کی روشنی میں)

پروفیسر خورشید احمد سینیٹ آف پاکستان کے چار مرتبہ رکن بنے۔ مجموعی طور پر ان کی رکنیت کا عرصہ ۲۱ سال پر محیط ہے۔ اس دوران انھوں نے متعدد اہم کمیٹیوں کی سربراہی کی یا ان کے رکن کی حیثیت سے کلیدی کردار ادا کیا۔ بطور ممبر سینیٹ آف پاکستان جمہوریت، دستور و قانون سازی، نفاذِ شریعت، قومی سلامتی، معیشت، تعلیم، خارجہ پالیسی اور دفاع وطن سمیت متعدد اہم موضوعات پر فکر انگیز خطابات کے ذریعے سینیٹ آف پاکستان کے فیصلوں کو انھوں نے متاثر کیا۔ ارمغان خورشید سیریز میں شائع ہونے والی کتب میں ان میں سے کچھ منتخب تقاریر مختلف عنوانات کے تحت شامل ہیں۔ کتاب کے اس حصہ میں پروفیسر صاحب کی دو تقاریر شامل کی گئی ہیں۔ پہلی تقریر ۲۰ مارچ ۱۹۹۷ء کی ہے جب پروفیسر صاحب کی سینیٹ کی دوسری مدت کا اختتام ہوا تھا جبکہ دوسری تقریر ۹ مارچ ۲۰۱۲ء کی ہے جب ان کی بحیثیت مجموعی ۲۱ سالہ رکنیت اختتام کو پہنچ رہی تھی۔

باب نمبر ۱۱

الوداعی خطاب: ۲۰ مارچ ۱۹۹۷ء

- ۱ -

میرے لیے یہ ایک بڑا اہم دن ہے۔ اس لیے کہ اس ایوان میں ۱۲ سال گزارنے کے بعد آج میں آپ سے الوداعی خطاب کر رہا ہوں۔ اس موقع پر میں اپنے دل کی چند باتیں بہت ہی صفائی اور دیانت داری کے ساتھ آپ کے سامنے اور آپ کے ذریعہ اس ایوان اور قوم کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔

جب ۲۱ مارچ ۱۹۸۵ء کو ہم نے پہلی بار سینیٹ کا حلف اٹھایا آپ میں سے جو ارکان اس میں موجود تھے انہیں یاد ہو گا کہ میں نے اس وقت کہا تھا کہ آج کا دن رسمی مبارک باد کا دن نہیں بلکہ ہماری آزمائش کا دن ہے۔ اگر مبارک باد کے مستحق ہوں تو اس وقت جب ہم اپنی ذمہ داریاں ادا کر کے اس ایوان سے رخصت ہو رہے ہوں گے اور اگر ہم نے اپنی ذمہ داریاں ادا نہ کیں تو پھر ہم مبارک باد کے نہیں ملامت کے مستحق ہوں گے۔ جنابِ والا! آج اسی بات کو اٹھاتے ہوئے اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی بنیاد پر کہ "احتساب کرو، قبل اس کے تمہارا احتساب کیا جائے"، میں چاہتا ہوں کہ چند باتیں صرف نکات کی صورت میں آپ کے سامنے رکھوں۔ تاکہ ہمارے سامنے یہ بات آسکے کہ اس ۱۲ سال میں اس سینیٹ کی کارکردگی کا معیار کیا رہا ہے۔ ہم نے کیا حاصل کیا، کیا خدمات رہیں، اور کہاں ہم ناکام رہے۔ تاکہ آنے والوں کے سامنے وہ ایجنڈا بھی آسکے اور چیلنج بھی آسکے جس کو انہوں نے لے کر چلنا ہے۔

سینیٹ کی خدمات

۱۔ رولز آف بزنس: سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ اس سینیٹ نے پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار ضابطۂ کار اور رولز آف بزنس کو تیار کیا۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ جب ۱۹۱۸ء میں پہلی مرتبہ برصغیر میں انتخابات شروع ہوئے اور ۱۹۳۵ء کے قانون کے تحت مرکز اور صوبوں میں اسمبلیاں بنیں تو برطانوی دور کے مطابق ضابطۂ کار بنایا گیا تھا۔ مجھے بڑے دکھ سے یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ ۱۹۴۵ء سے لے کر ۱۹۸۵ء تک کسی منتخب ایوان نے اس بات کی زحمت نہیں کی کہ دستور نے ان کو اپنے رولز بنانے کا جو اختیار اور حق دیا تھا اسے استعمال کرتے ہوئے اپنی آزادی اور خود اختیاری کو حاصل کریں اور اپنا ضابطۂ کار بنائیں۔ اس ایوان نے دو سال کی شب و روز محنت کے بعد نئے رولز آف بزنس تیار کر کے اس ملک میں پارلیمانی نظام کی سب سے بڑی خدمت کی ہے۔

ان رولز کے نتیجے کے طور پر حقیقت یہ ہے کہ جو اختیار دستور نے اس ایوان کو دیا تھا اس کا کم از کم ایک حصہ ہم متشکل کر سکے۔ اور یہ بات بھی کہنے کی مجھے اجازت دیں کہ ۱۹۸۸ء میں سینیٹ کے رولز بننے کے بعد قومی اسمبلی کو بھی اس بات کا احساس ہوا کہ رولز پر نظر ثانی ہونا چاہیے۔ اور پانچ سال کے بعد ۱۹۹۳ء میں سینیٹ کے رولز کی روشنی میں انہوں نے اپنے لیے رولز بنائے۔ میرے خیال میں یہ اس ایوان کا پہلا بڑا کارنامہ ہے۔

۲۔ کمیٹی سسٹم: دوسرا کارنامہ اس کا کمیٹی سسٹم ہے۔ پاکستان کی پارلیمانی تاریخ میں یہ ایک منفرد خدمت ہے جو سینیٹ نے انجام دی ہے۔ اس میں پہلی چیز یہ ہے کہ کمیٹیوں کو حکومتی کنٹرول سے آزاد کیا گیا۔ وزیر کے بجائے ان کا اپنا منتخب چیئرمین ہوتا ہے۔ کمیٹیوں کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ احتساب بھی کریں اور مختلف قراردادیں جو آتی ہیں انہیں بھی لیں۔ یہ کمیٹیاں از خود کارروائی کر کے حکومت کو مجبور کر سکتی ہیں کہ وہ ان کے سامنے تمام فائلیں کھولے۔ یہ اسی نوعیت کی ایک کامیابی ہے جو برطانوی پارلیمنٹ نے بادشاہ اور ہاؤس آف لارڈز کے خلاف تقریباً دو سو سال میں حاصل کی۔ نئی کمیٹیاں بھی قائم کی گئی ہیں۔ جن میں خاص طور پر کم ترقی یافتہ علاقوں کی کمیٹی، انسانی حقوق کی کمیٹی وغیرہ وہ کمیٹیاں ہیں جن کے

ذریعے احتساب کا عمل ہمارے ہاں کسی نہ کسی شکل میں شروع ہوا ہے۔

ان کمیٹیوں نے بڑی گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ ایوان اور ملک نے اس سے پورا پورا فائدہ نہیں اٹھایا۔ تاہم اس موقع پر صرف چند اہم رپورٹس کی طرف اشارہ بھی مناسب ہو گا۔ سب سے اہم تاریخی رپورٹ سندھ کمیٹی کی رپورٹ تھی۔ جس نے آج سے سات سال پہلے سندھ کے شہری اور دیہی مسئلے کا جائزہ لیا۔ آٹھ مہینے کی محنت کے بعد پینتالیس سفارشات پیش کیں۔ اگر ان پر عمل ہوتا تو صورت حال آج اتنی خراب نہ ہوتی۔ ڈرگ پالیسی پر ۸۰ صفحات کی سفارشات پیش کی گئیں۔ ٹیکسیشن سسٹم ریفارمز پورے نظام کا جائزہ لینے کے بعد سو صفحے کی رپورٹ پیش کی گئی۔ پرائیویٹائزیشن آف بنکس کی رپورٹ، اسلامی نظریاتی کونسل کی دو اہم رپورٹیں، زکوٰۃ و عشر، اصلاح معاشرہ اور یو بی ایل کی پرائیویٹائزیشن پر رپورٹ اور اس ضمن میں جو خرابیاں ہیں اس پر رپورٹ۔ اس کے بعد پھر رائس کارپوریشن کے معاملے پر رپورٹ پیش کر کے سینیٹ اور اس کی کمیٹیوں نے بڑا اہم کارنامہ انجام دیا اور قومی دولت کو بچانے کے لیے خدمات انجام دیں۔

خارجہ کمیٹی کی رپورٹ پہلی مرتبہ آئی ہے۔ اس میں سیاسی مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے اور اس پر ایک متفقہ مؤقف پیش کیا گیا ہے۔ شوگر انڈسٹری کی رپورٹ اور پھر جو آٹھ رپورٹس پیش کی گئی ہیں ان میں خصوصیت سے بینک نادہندگان کے بارے میں فنانس کمیٹی کی رپورٹ ہے، جس میں اس پورے مسئلے کا جائزہ لے کر بڑی مستحکم تجاویز اس کی اصلاح کے لیے دی گئی ہیں۔ تو یہ سینیٹ کی ایک اہم خدمت ہے جو اس نے ملک کے لیے انجام دی ہے۔

۳۔ "ایمپلائز ویلفیئر فنڈ" اور سروس سٹرکچر: اس ایوان نے اپنے استحقاق کے ساتھ ساتھ سینیٹ کے کمزور طبقے، خاص طور پر وہ ملازم جو افسروں کے درجے میں نہیں آتے، کے مصائب اور ضروریات پر بھی توجہ دی ہے۔ اور میں اس کی فنانس کمیٹی کو مبارک باد دیتا ہوں کہ پہلی مرتبہ سینیٹ کی تاریخ میں بلکہ پارلیمنٹ کی تاریخ میں "ایمپلائز ویلفیئر فنڈ" قائم ہوا۔ اس میں کچھ افراد نے اپنی پوری تنخواہ لیکن باقی سب نے بھی کچھ نہ کچھ تعاون کیا ہے۔

اور اس طرح لاکھوں روپے کا فنڈ بنا کہ جس سے ہم اپنے کم تنخواہ والے ملازمین کو ضرورت کے وقت کچھ ریلیف دے سکتے ہیں۔ ایک قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ تین بار سینیٹ کی فنانس کمیٹی نے وزارتِ خزانہ سے اس فنڈ کو انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دینے کی درخواست کی، جسے قبول نہیں کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ رقم عطیہ کر رہے ہیں جنہوں نے اپنی جیب سے انکم ٹیکس بھی دیا ہے اور اپنی تنخواہ بھی دی لیکن حکومت کی طرف سے انہیں تعاون نہیں ملا۔

سینیٹ کی فنانس کمیٹی کا ایک اور اہم کام یہ ہے کہ پہلی مرتبہ سینیٹ کی تاریخ میں ایکس کیڈر (Ex-Cadre) دوسرے ملازمین جو گیارہ گیارہ بارہ بارہ سال سے ایک جگہ پر پھنسے ہوئے تھے اور ترقی کا کوئی امکان نہیں تھا ان سب کے معاملات پر غور کر کے ایک پورا سروس سٹرکچر بنایا گیا، ان کے لیے ترقی کے امکانات پیدا کیے اور ساتھ ہی یہ اصول بھی رکھا کر میرٹ اور کارکردگی کی بنیاد پر انہیں آگے بڑھنے کا موقع ملے گا۔

سینیٹ میں بحث کا جو معیار رہا ہے اس میں حاضری کی جو کیفیت رہی ہے کم از کم پہلے چھ سال مجھے یاد نہیں پڑتا کہ دو یا تین بار سے زیادہ ہمارے یہاں کورم ٹوٹا ہو۔ میں اس بات کو اس لیے کہنا چاہتا ہوں کہ کم از کم سینیٹ کو اپنی ان تمام روایات کو باقی رکھنا چاہیے۔

۴۔ تاریخی قراردادیں: میں اس موقع پر کچھ تاریخی قراردادوں کا ذکر بھی کرنا چاہتا ہوں جو سینیٹ نے پاس کی تھیں۔ ان میں سب سے پہلی قرارداد دستوری مسائل پر تھی۔ جس وقت آٹھویں ترمیم منظور ہوئی ہے اس وقت سینیٹ نے متفقہ طور پر یہ قرارداد پاس کی تھی کہ ابھی اس بات کی ضرورت ہے کہ دستور کی اسلامی دفعات اور جمہوری دفعات میں مزید غور وخوض کر کے ان کو قراردادِ مقاصد سے ہم آہنگ کیا جائے (مجھے افسوس ہے کہ اس متفقہ قرارداد پر کام نہیں ہوا لیکن سینیٹ نے یہ نوٹس لیا ہے)۔ اس کے بعد سینیٹ نے سینیٹ کے مالیاتی اختیارات کے بارے میں متفقہ طور پر ایک قرارداد پاس کی تھی کہ سینیٹ کو کم از کم بجٹ پر غور کرنے اور اپنی رائے دینے کا موقع ملنا چاہیے اس کے بغیر ہم فیڈریشن کے تقاضے پورے نہیں کر سکتے۔ یہ بھی ابھی تک التوا کا شکار ہے۔ تیسری بڑی اہم قرارداد

پاک ہند تعلقات پر تھی جو ۱۹۸۹ء میں متفقہ طور پر اس ایوان نے پاس کی۔ میرے خیال میں سینیٹ کی یہ کارکردگی لائقِ تحسین ہے۔

پیش رفت کے ناگزیر تقاضے

اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ ہم کچھ چیزوں میں ناکام بھی رہے ہیں اور اس کا اعتراف بھی ضروری ہے۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ ہم خود اپنی کمزوریوں کا اعتراف کریں تاکہ نئی حکومت نیا ایوان ان معاملات پر کام کر سکے۔ سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ دستوری ترامیم کے سلسلے میں صحیح پیش رفت نہیں ہوئی خواہ وہ سینیٹ کے انتخاب ہوں، اسلامی دفعات ہوں، عدالت یا وفاقی شرعی عدالت کے اختیارات کا معاملہ ہو، یا وہ خواتین کی نمائندگی کا معاملہ ہو۔ یہ بڑے اہم کام ہیں جن کا صحیح حق ہم ادا نہیں کر سکے اور ہمیں آئندہ کے ایجنڈے میں اس کو ترجیح دینی چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ سینیٹ کے انتخاب کے طریقۂ کار پر بھی غور کرنے کا وقت آگیا ہے۔

دنیا کی تاریخ کو دیکھیے۔ بالواسطہ انتخاب کی کچھ خوبیاں ہوتی ہیں لیکن کچھ خامیاں بھی ہوتی ہیں اور ایک وقت آتا ہے کہ بالواسطہ انتخاب سے براہ راست انتخاب یا وسیع تر بنیاد پر انتخاب کے بارے میں سوچنا پڑتا ہے۔ جب ہم ذرائع ابلاغ میں یہ پڑھتے یا سنتے ہیں کہ سینیٹ کے انتخاب میں پیسہ چلا ہے۔ کروڑوں روپے دے کر ووٹ حاصل کیے گئے ہیں تو اس سے ان اداروں کا وقار گرتا ہے۔ اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ سینیٹ کے الیکشن کے طریقے پر بھی غور کیا جائے۔ تیسری بات یہ کہ سینیٹ کی قراردادیں، سینیٹ کی کمیٹیوں کی رپورٹیں، سینیٹ میں تحاریکِ التوا پر بحث، ان تمام کے بارے میں قوانین موجود نہیں کہ حکومت کا ردِ عمل کیسے حاصل کیا جائے۔ میں تجویز پیش کروں گا کہ قوانین میں رد و بدل کیا جائے تاکہ سینیٹ کی کسی بھی کارروائی پر حکومت کو ایک متعین وقت کے اندر اپنا ردِ عمل ظاہر کرنے کا پابند کیا جائے۔ قبول کرے یا انکار کرے۔ اگر انکار بھی کرے تو دلائل دے کہ ہم سینیٹ کی ان تجاویز کو آخر کیوں نہیں مان رہے ہیں تاکہ نتیجہ خیز انداز میں بحث

درست رخ پر ہو سکے اور تمام نقطہ ہائے نظر قوم کے سامنے آ سکیں۔

چوتھی بات یہ ہے کہ استحقاق کا قانون بنایا جائے جو کہ ہمارے دستور کی ضرورت ہے، ہمارے قواعد کی ضرورت ہے اور اس ایوان کی ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں ذاتی استحقاق کی بات تو ہوتی ہے حالانکہ سب سے اہم چیز ادارے کا استحقاق ہے کہ ہم دستور کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جو کردار ادا کر سکتے ہیں وہ احسن طریق پر کر سکیں۔ اس کے لیے ہمارے ملک میں استحقاق کا قانون (پریویلج ایکٹ) بننا چاہیے۔ جس کے اندر تنبیہ کی گنجائش بھی ہو۔ برطانوی پارلیمنٹ میں یہ روایت ہے کہ اگر برطانوی پارلیمنٹ کے اسپیکر چاہیں تو کسی شخص کی گرفتاری کے آرڈر بھی دے سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے پاس یہ اختیارات نہیں ہیں۔ اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ اس کے لیے استحقاق کا قانون بنے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اجلاس کی ریکوزیشن حکومت نہیں مانتی۔ کمیٹی آرڈر دیتی ہے لیکن حکومت نہیں مانتی تو جب تک قانون استحقاق نہ ہو اور اس کے لیے تنبیہ کا نظام نہ ہو اس وقت تک ہم یہ کام نہیں کر سکیں گے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ گو سینیٹ نے اپنے آپ کو متحرک بھی کیا ہے اور اپنے لیے اختیارات حاصل بھی کیے ہیں لیکن مشترکہ اجلاس اور مشترکہ کمیٹی برائے نام اور نمائشی ادارے بن کر رہ گئے ہیں۔ مشترکہ کمیٹی قانون سازی کے لیے بھی اور احتساب کے لیے بھی ایک اہم ادارہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ چیئرمین سینیٹ اور قومی اسمبلی کے اسپیکر مل کر اس معاملے میں مشترکہ کمیٹی بنانے کا قدم اٹھائیں اور اس کو متحرک کرنے کی کوشش کریں۔ چھٹی چیز شعبۂ تحقیق ہے۔ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ممبران کو قانون سازی کے لیے تکنیکی امداد حاصل ہو۔ اس معاملے میں آغاز تو کیا گیا ہے لیکن ابھی یہ بالکل ناکافی ہے۔ اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

الحمدللہ اس ایوان نے بہت کام کیا ہے۔ اس کے کریڈٹ میں بے شمار چیزیں آتی ہیں لیکن جب میں زیرِ التوا کاموں کی فہرست دیکھتا ہوں تو میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ حکومت کے پاس ایسے دو بل موجود ہیں جو سینیٹ نے منظور کیے ہیں اور اسمبلی نے منظور

نہیں کیے ہیں۔ آج تک ان کی قسمت کا فیصلہ نہیں ہوا۔ حکومت کے سترہ بل اس ایوان کے سامنے زیرِ غور ہیں۔ جن میں سے ایک ۱۹۸۷ء سے ہے، ایک ۱۹۹۴ء سے ہے اور پندرہ ۱۹۹۶ء سے ہیں۔ یہ بات سینیٹ کے کریڈٹ میں ہے کہ ۴۵ پرائیویٹ ممبرز بل ہیں جو اس سینیٹ کے اندر گزشتہ ۱۲ سالوں میں متعارف ہوئے ہیں جبکہ حکومت کی طرف سے اتنے بل یہاں نہیں آئے ہیں۔ لیکن ان میں سے ۳۰ بل ابھی تک التوا میں ہیں۔ ان میں سے ایک ۱۹۸۸ء سے ہے، ایک ۱۹۹۰ء سے ہے، ایک ۱۹۹۱ء سے ہے، ایک ۱۹۹۲ء سے ہے، دو ۱۹۹۳ء سے ہیں، تین ۱۹۹۴ء سے ہیں، دو ۱۹۹۵ء سے ہیں اور انیس ۱۹۸۶ء سے ملتوی ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہم اپنے فرائض کماحقہ ادا نہیں کر سکے۔ ہماری کمیٹیاں بھی ان کا حق ادا نہ کر سکیں۔ وہ رپورٹیں یہاں نہیں آئیں اور ہم قانون حاصل نہ کر سکے۔

۵۷ تحاریکِ التوا اس وقت تاخیر کا شکار ہیں۔ جبکہ چیئرمین کی ۱۶ رولنگز بھی التوا میں پڑی ہیں۔ تحریکِ استحقاق کا مطلب یہ ہے کہ اسے ہر چیز کے اوپر ترجیح دی جائے۔ لیکن اگر تحاریکِ استحقاق بھی ملتوی ہو جائیں تو یہ ہمارے لیے کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی ناکامی کا اعتراف کریں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان تمام چیزوں کو بطور ایجنڈا اپنے آنے والوں کے سامنے رکھیں کہ اب آپ کو یہ کام سرانجام دینا ہے۔

احتساب کی ضرورت: اتنا مزید کہنا چاہتا ہوں کہ جہاں نئی حکومت کو ایک غیر معمولی مینڈیٹ ملا ہے، قوم نے آپ سے بہت سی امیدیں وابستہ کی ہیں، وہیں آپ کی ایک بہت بڑی آزمائش اور امتحان بھی ہے اور اگر خدانخواستہ آپ امتحان میں پورے نہ اترے تو یہ صرف آپ کے لیے ہی نہیں ہے بلکہ ملک میں جمہوریت کے مستقبل کے لیے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے خدارا! آپ ذمہ داری اور محنت کے ساتھ اس کام کو کریں۔ بلاشبہ یہ انتخابات بھی ایک طرح کا احتساب ہیں لیکن محض انتخابات احتساب نہیں۔

آپ کو احتساب کرنا چاہیے۔ احتساب کے بغیر یہ ملک پاک نہیں ہو گا۔ احتساب محض بیوروکریسی کا ہی نہیں بلکہ سیاستدانوں کا بھی۔ ان لوگوں کا بھی جو کسی بھی مقام پر ہوں

اور خواہ ان کا تعلق فوج سے ہو، عدلیہ سے ہو، سیاست سے ہو، بیوروکریسی سے ہو۔ اختیار کے مقام پر جو بھی آئے، اس کا احتساب ہونا چاہیے اور انصاف کے ساتھ بے لاگ اور کسی سیاسی مفادات کے بغیر ہونا چاہیے۔

اس ملک کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ نظم و نسق اور اچھی حکمرانی ہمارے ہاں ناپید ہے۔ جمہوریت قانون کی بالادستی کا نام ہے۔ جمہوریت یہ نہیں ہے کہ آپ بادشاہوں کی طرح جس کے سر پر چاہیں تاج رکھ دیں اور جس کے ہاتھ میں چاہیں ہتھکڑی لگا دیں۔ جمہوریت نام ہے قانون کے بالاتر ہونے کا۔ جب تک آپ یہ نہیں کریں گے آپ معاملات کو درست نہیں کر سکتے۔

آخر میں نئی حکومت سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حقائق کا سامنا کیجیے۔ میں قرض اتارو ملک سنوارو تحریک کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ یہ ایک بروقت کوشش ہے لیکن آپ محض قرض لے کر قرض کے بوجھ سے نہیں نکل سکتے۔ اب یہ بھی ہونا چاہیے کہ قرض ادا کرو۔ جن لوگوں نے قرض لیے ہیں، ۱۲۰ سے ۱۴۰ بلین روپے کے قرضے وہ ادا کریں۔ آپ یہ مہم بھی چلائیں کہ ٹیکس دو۔ جن لوگوں نے ۱۰۰، ۱۱۰ بلین کے جو ٹیکس ادا نہیں کیے ہیں وہ آئیں اور ٹیکس دیں۔ آپ یہ مہم بھی چلائیں کہ ملک سے باہر جو دولت لے گئے ہو وہ واپس لاؤ۔ وہ دولت آئے گی تو آپ کے مسائل حل ہوں گے۔ اپنے طرزِ زندگی کو بدل لیجیے۔ اپنے وسائل سے زیادہ طرزِ زندگی گزارنے کی روایت کو اوپر سے نیچے تک تبدیل ہونا چاہیے۔ جب تک کہ آپ طرزِ زندگی کو بدل نہیں لیں گے، جب تک کہ آپ پیداوار نہیں بڑھائیں گے اس وقت تک آپ عالمی مسابقت میں آگے نکلنے کے لائق نہیں بنیں گے جب تک آپ تعلیم نہیں بڑھائیں گے اور جب تک آپ ایک دوسرے کی جان اور مال کو تحفظ نہیں دیں گے، اس ملک کی تقدیر نہیں بدلی جا سکے گی۔ (۲۰ مارچ ۱۹۹۷ء)

الوداعی خطاب: ۹مارچ ۲۰۱۲ء

- ۲ -

جناب چیئرمین! میرے لیے آج کا دن غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ اس معزز ایوان میں، میں نے ۱۲مارچ ۱۹۸۵ء کو قدم رکھا اور چیئرمین صاحب کے انتخاب کے بعد پہلی تقریر میں نے کی اور آج میں الوداعی خطاب کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے، جماعت اسلامی کی تائید اور آپ حضرات کے تعاون سے میں نے اس ایوان میں ۲۱ سال گزارے۔ یہ دور ایسا ہے کہ جس پر میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں کہہ پاتا کیونکہ یہ میری زندگی کے بڑے فیصلہ کن سال رہے ہیں۔ وسیم سجاد صاحب کے ساتھ مجھے بھی یہ اعزاز حاصل ہے کہ شاید اس ایوان کے طویل عرصہ تک رہنے والے اراکین میں سے ایک میں ہوں۔ اس کی یادیں ہمیشہ رہیں گی اور میں ہمیشہ اس ایوان کے مضبوط تر، مؤثر تر ہونے اور پاکستان کی تعمیر میں ایک کلیدی کردار ادا کرنے کے لیے دعا گو رہوں گا۔

اظہار تشکر

جنابِ والا! میں اپنے فرض میں کوتاہی کروں گا اگر سب سے پہلے آپ کا شکریہ ادا نہ کروں۔ ہر چیئرمین نے اپنے اپنے انداز میں اس ایوان کو چلانے کی کوشش کی ہے لیکن میری نگاہ میں آپ کا بڑا کردار ہے۔ ایک طرف آپ نے دستور، قانون اور ضوابط کی پابندی کا اہتمام کیا اور دوسری طرف جو سب سے مشکل کام تھا کہ ایک سیاسی پارٹی سے وابستگی اور منصب کے تقاضوں کا احترام آپ نے اس کا خیال رکھا۔ آپ نے اس منصب کے تقدس کو

برقرار رکھتے ہوئے اس میں جس توازن، اعتدال اور ہم آہنگی کی ضرورت ہے اس کا مظاہرہ کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اچھی مثال آپ نے قائم کی ہے۔ آنے والے چیئرمین کے لیے بھی میں یہ بات بڑے ادب سے عرض کروں گا کہ وہ اس روایت کو قائم رکھیں۔ یہ جمہوریت کی جان اور اس ایوان کی عزت، تقدس اور حفاظت کے لیے بے حد ضروری ہے۔ میں کھلے دل سے آپ کو ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں اور آپ کے لیے اپنی دعائیں پیش کرتا ہوں۔ ساتھ ہی میرا فرض ہے کہ ڈپٹی چیئرمین صاحب کے لیے بھی، جنہوں نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اور شگفتہ انداز میں اس پورے ایوان کو آپ کی عدم موجودگی میں چلایا اور ویسے بھی اپنا کردار ادا کیا، اپنی دعائیں پیش کروں۔

سینیٹ کا عملہ بھی میری نظر میں بڑی مبارکباد کا مستحق ہے۔ خصوصیت سے راجہ محمد امین صاحب اور اس وقت ہمارے سیکرٹری افتخار اللہ بابر صاحب، محبوب صاحب، انور صاحب اور دوسرے وہ تمام افراد جو اس میں اپنا اپنا کردار ادا کرتے رہے ہیں مبارکباد کے مستحق ہیں۔ میں ان افراد کا ذکر بھی خاص طور پر کرنا چاہتا ہوں جو اسٹیج پر تو نہیں بیٹھتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی خدمات کی وجہ سے ہی ہم سب اپنا اپنا کام مؤثر انداز میں ادا کر سکے۔ اس میں خصوصیت سے رپورٹر حضرات، جنہوں نے ہماری تقاریر کو محفوظ کیا ہے، میں ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ بلاشبہ ابھی مزید بہتری کی ضرورت ہے لیکن بہرحال میں ان کے کام کی قدر کرتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ سینیٹ کا پورا عملہ بشمول ہمارے نائب قاصد شکریہ کے مستحق ہیں۔ صحافی حضرات کا بھی میں شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں اور پریس، الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کا بھی جنہوں نے ہماری بات کو قوم تک پہنچانے کا کردار ادا کیا۔

چند قابل قدر اقدامات

اب جنابِ والا! مجھے اجازت دیں کہ سینیٹ کی کارکردگی کے حوالہ سے میں خاص طور پر ایک دو چیزوں کی طرف آپ کو متوجہ کروں۔

سینیٹ شعبۂ تحقیق: یہ اس سینیٹ کا بڑا کردار ہے کہ ۱۹۸۵ کے بعد اس نے شعبۂ تحقیق کو قائم کرنے کی کوشش کی۔ گو اراکین کو جو تحقیقی معاونت اور جس درجہ میں قانونی معاونت ملنی چاہیے وہ ابھی بھی موجود نہیں ہے لیکن اس کا آغاز آپ نے کیا۔ میں یہ بات کہنے میں خوشی محسوس کرتا ہوں کہ اس وقت گو سینیٹ کے ارکان کی تعداد قومی اسمبلی کے ایک تہائی کے قریب ہے لیکن ہمارے تحقیقی عملے میں گیارہ افراد ہیں جبکہ ہمارے بعد نیشنل اسمبلی نے اس کا آغاز کیا اور اب وہاں نو افراد ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اس میں آپ کا بڑا کردار ہے۔

اسٹاف ویلفیئر فنڈ: اسی طرح میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اسٹاف ویلفیئر فنڈ کا تصور ایک جدت ہے جو ہم نے اس سینیٹ میں قائم کی۔ میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس کی ابتداء کرنے کی توفیق مجھے حاصل ہوئی اور اس کے نتیجے کے طور پر گریڈ ایک سے سولہ تک کے لوگوں میں سے ایک بڑی تعداد کو ہر سال ایک بڑی رقم ملنے کا انتظام ہو رہا ہے۔ میں اس وقت خاص طور پر سینیٹ کے آنے والے اراکین سے درخواست کروں گا کہ آپ اس ادارے کو مضبوط کیجیے۔ اس فنڈ میں دل کھول کر تعاون کیجیے۔ یہ بڑی روشن روایت ہے جو ہم نے قائم کی ہے۔ اسے جاری رکھنا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بات بھی اپنے سامنے رکھنی چاہیے کہ سینیٹ نے خود اپنی ترقی کے سفر کو چاہے سست رفتاری سے ہو لیکن اس کو جاری رکھا ہوا ہے۔ جب ۱۹۷۳ء میں سینیٹ قائم ہوئی تو اس کے صرف ۶۳ ممبرز ہوتے تھے۔ اس کے بعد اس میں ٹیکنوکریٹس، خواتین اور غیر مسلموں کا اضافہ ہوا، تعداد بڑھی اور آج ہماری تعداد ۱۰۴ ہے۔

سینیٹ کے اختیارات اور کارکردگی میں بہتری: اسی طرح اگر آپ سینیٹ کے اختیارات کو دیکھیں تو جس وقت یہ ایوان قائم ہوا اس وقت اس کا کردار مبہم اور اختیارات نہ ہونے کے برابر تھے۔ آٹھویں ترمیم اور ۱۸ویں ترمیم کے ذریعے ہم نے بڑی منظم کوشش کی ہے کہ سینیٹ کے کردار کو مرتب بھی کیا جائے اور آگے بڑھایا جائے لیکن ابھی ہمیں بہت سے بڑے مراحل طے کرنے ہیں۔

سینیٹ کی کارکردگی میں بہتری کے لیے تجاویز

اس ضمن میں آج میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں، اور خاص طور پر جو نئی ٹیم ان شاء اللہ آرہی ہے میں اس سے درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ ابھی سینیٹ کو وہ مقام نہیں ملا ہے جو ایک فیڈریشن کے خوش اسلوبی سے کام کرنے کے لیے ضروری ہے۔ میرے خیال میں اس ضمن میں دو تین چیزیں بڑی ضروری ہیں۔ ایک چیز یہ ہے کہ سینیٹ کو وہی پوزیشن حاصل ہونی چاہیے جو قومی اسمبلی کی ہے اور یہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک سینیٹ کے اراکین براہِ راست منتخب نہ ہوں۔ جناب چیئرمین! میں نے جتنا بھی غور کیا، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ براہِ راست انتخاب کے بغیر سینیٹ فیڈریشن کی حفاظت کا وہ کردار ادا نہیں کر سکتی جس کے بغیر فیڈریشن مکمل نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ ہمارے ملک کی جو پیچیدگیاں ہیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے اگر ہم سینیٹ کے براہ راست انتخاب کو متناسب نمائندگی کے اصول پر مرتب کریں تو یہ ایک عملی چیز ہو گی۔ اس میں تمام سیاسی نقطۂ نظر سامنے آسکیں گے اور اس کو منعقد کرنا زیادہ آسان ہو گا۔ یہ ایک اہم قدم ہے اور اس کا ہونا بہت ضروری ہے۔

اس کے ساتھ ہی جنابِ والا! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سینیٹ کے موجودہ طریقۂ انتخاب کی بنا پر پیسا چلنے، سیاسی جوڑ توڑ اور مداخلت کے جو معاملات سامنے آرہے ہیں وہ حقیقت میں اس ادارے کے کردار پر ایک بدنما دھبہ ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اکثریت کا دامن پاک ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ لوگوں کا اس ادارے پر اعتبار متاثر ہو رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دیگ کے صرف چند چاول بھی ٹھیک نہ ہوں تو اس سے پوری دیگ پر اثر پڑتا ہے۔ اس لیے میں چاہوں گا کہ جہاں ہمیں اپنے آئینی کردار کے لیے برابر جدوجہد کرنی ہے وہیں اپنی اخلاقی پوزیشن کو مستحکم کرنا ہے۔ میرے نزدیک اس ضمن میں دو اداروں کے درمیان کوئی مسابقت نہیں ہے بلکہ یہ وفاق کو اور اس ملک کو مضبوط کرنے اور جمہوریت کو فروغ دینے کے لیے معاون ہو گا۔

جنابِ والا! یہاں بار بار کہا گیا کہ یہ صرف قانون ساز ادارہ ہے۔ بلا شبہ قانون ساز ادارہ ہے اور قانون سازی کے سلسلے میں ایک بڑا کلیدی کردار دونوں ایوانوں نے ادا کرنا ہے لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ اور کام ہیں جو کم اہم نہیں ہیں۔ ہم نے ان میں سے ہر ایک کے بارے میں کچھ خدمات انجام دینے کی کوشش کی ہے۔ ان باتوں کو آئندہ کے لیے بھی ہمیں اپنے سامنے رکھنا چاہیے اور سینیٹ کی کارکردگی کو جب بھی آپ جانچنے کی کوشش کریں تو اس میں ان سب کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

قواعد کار میں تبدیلی: جناب چیئرمین! سینیٹ اور قومی اسمبلی قومی جذبات، احساسات کے اظہار کا ایک ادارہ ہے یہ قوم کی زبان ہے اس لیے آپ دیکھیے کہ خاص طور پر قراردادیں اور توجہ دلاؤ نوٹسز اس کا اہم حصہ ہیں۔ اس کے ساتھ سب سے اہم چیز جو ہم نے کی ہے وہ رولز آف بزنس میں یہ تبدیلی ہے کہ جس چیز کو ہم پوائنٹ آف آرڈر کے نام پر زبردستی حاصل کیا کرتے تھے اس کے لیے اب ایک ادارتی انداز میں ہر روز یہ موقع ملے گا کہ روزمرہ کے مسائل کو اٹھایا جاسکے۔ میرے خیال میں یہ ایک اہم پیش رفت ہے اور عوام کے جذبات کے اظہار کے لیے یہ بات ضروری ہے۔ ساتھ ہی آپ کو معلوم ہے کہ تحریکِ التواء وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے عوام کی مشکلات اور ان کے مسائل کو ایوان میں لایا جاسکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس پہلو سے سینیٹ نے بڑی اہم خدمت انجام دی ہے۔ اگر آپ تحریکِ التواء کی تعداد کو دیکھیں تو اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس اعتبار سے ہم نے کیا کردار ادا کیا ہے۔

پالیسی سازی میں کردار: جنابِ والا! اگلی چیز پالیسی سازی میں کردار ہے۔ بلا شبہ انتظامیہ پالیسیوں کا نفاذ کرتی ہے لیکن پالیسی بنانا پارلیمنٹ کا کام ہے۔ ریاستی پالیسی کے رہنما اصول دستور میں لکھے گئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کو پالیسی سازی کے لیے بنیاد بنا کر ہم نے پارلیمنٹ کا کردار ادا نہیں کیا۔ یہ بات ریکارڈ پر لاتے ہوئے ہمیں دکھ ہوتا ہے کہ رہنما اصول کے مفہوم میں دستور لازم کرتا ہے کہ ہر سال اس کی رپورٹ آئے۔ پہلے صرف قومی اسمبلی میں آنا ہوتی تھی اور اب دونوں ایوانوں میں آنی ہوتی ہے لیکن برسوں تک یہ نہیں آیا کرتی

تھی۔ جناب چیئرمین! مجھے خوشی ہے کہ ہمارے آواز اٹھانے پر آپ نے اصرار کیا اور اب وہ رپورٹس آرہی ہیں۔ ان کا پالیسی سازی میں بھی بڑا اہم کردار ہے۔

کمیٹیوں کا نظام: جناب چیئرمین! سینیٹ کا چوتھا کردار، جو میری نگاہ میں بہت ہی زیادہ اہم ہے، وہ انتظامیہ پر نظر رکھنا اور ان کا احتساب ہے۔ یہ بڑا کمزور تھا لیکن اس سینیٹ نے کمیٹی سسٹم لاکر انتظامیہ کے محاسبے کو مضبوط کیا ہے۔ جنابِ والا! کمیٹی سسٹم کے بارے میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ ہم نے ایک بڑا تاریخی اضافہ کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ محض اسٹینڈنگ کمیٹیاں نہیں بلکہ عملدرآمد کمیٹیاں بھی ہیں اور عملدرآمد کمیٹیوں کا تصور یہ ہے کہ وہ مسائل سے منسلک ہیں اور ان میں حکومتی یقین دہانیوں، پسماندہ علاقوں اور انسانی حقوق سے متعلق تمام چیزوں کو ہم نے لیا ہے۔

توجہ طلب چند مسائل

جنابِ والا! یہ چار کردار ہیں اور ان چاروں کرداروں کو سامنے رکھ کر ہمیں سینیٹ کے ارتقاء کو دیکھنا چاہیے۔ میں آگے بڑھنے سے پہلے یہ بات کہنا چاہوں گا کہ جہاں اس پہلو سے سینیٹ نے میری نگاہ میں بڑا مثبت کردار ادا کیا ہے وہیں چند امور توجہ طلب بھی ہیں۔ میں اپنے اس الوداعی خطاب میں چاہتا ہوں کہ یہ امور ریکارڈ پر بھی آجائیں اور سینیٹ کے آنے والے ارکان بھی اس کی فکر کرسکیں۔

وقت کا ضیاع: جنابِ والا! پہلی چیز یہ ہے کہ جتنا وقت سینیٹ نے اپنے فرائض منصبی ادا کرنے میں دیا ہے میری نگاہ میں وہ ناکافی ہے۔ بلاشبہ دستور میں سال بھر میں سینیٹ اجلاس کے لیے اب ۹۰ سے ۱۱۰ دن ہو گئے ہیں لیکن میں نے خود بھی اس پر جو کام کیا ہے اور PILDAT نے اس معاملے میں جو تحقیق کی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اجلاس ہمیشہ آدھ گھنٹے سے ایک گھنٹے تک تاخیر سے شروع ہوئے ہیں۔ ہم نے جو اصل وقت صرف کیا ہے وہ اوسطاً تین گھنٹے یومیہ ہے جب کہ بھارت کے راجیہ سبھا میں اس کی چار گھنٹے

اوسط ہے اور برطانیہ میں اس سے بھی زیادہ ہے۔ زیادہ وقت دینا، اچھی حاضری ہونا اور اجلاس کو وقت پر شروع کرنا یہ ہمارے لیے بہت ضروری ہے۔

وزراء کی عدم دلچسپی: جنابِ والا! دوسری بات جس کا آپ نے بھی بار بار نوٹس لیا اور ہمیں بھی اس کو اٹھانا پڑا وہ وزراء کی اجلاس میں عدم دلچسپی اور عدم موجودگی ہے۔ بہت ضروری ہے کہ اس معاملے میں آپ اور آنے والے چیئرمین اس بات کا اہتمام کریں کہ وزراء کی موجودگی اس ایوان میں یقینی ہو۔ دستوری اعتبار سے پوری کابینہ سینیٹ کے سامنے جوابدہ ہے اور اس میں سہل انگاری کا رویہ کسی طرح قابلِ برداشت نہیں ہے۔ ہم نے یہ بھی ایک بہت اہم تبدیلی کی ہے کہ وزیر اعظم سینیٹ میں آئیں اور وقت دیں۔ PILDAT کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۰۰۹ء اور ۲۰۱۰ء میں وزیر اعظم صاحب پورے سال میں صرف پچیس منٹ کے لیے سینیٹ میں آئے ہیں۔ ۲۰۱۱-۲۰۱۰ میں یہ پچیس منٹ بھی کم ہو کر ۱۵ منٹ پر آ گئے ہیں۔ جنابِ والا! یہ شرمناک بات ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اس بات کو ہم اٹھائیں کیونکہ ایسا کرنا بہت ضروری ہے۔

قانون سازی پر عدم توجہ: میں قانون سازی کے باب میں بھی یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تین سال میں سینیٹ میں کل آٹھ قوانین متعارف ہوئے ہیں اور ۴۹ ایسے ہیں جو یہاں سے منظور ہوئے ہیں۔ جب میں اس کا ہندوستان کی راجیہ سبھا سے موازنہ کرتا ہوں تو راجیہ سبھا میں ان تین سالوں کے اندر ۱۳۲ قوانین منظور ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں قانون سازی اب بھی بہت پیچھے ہے اور آرڈیننس اب بھی جاری ہو رہے ہیں گو اس پر اب کچھ پابندیاں لگا دی گئی ہیں لیکن آئندہ سینیٹ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس پر کام کرے۔

اس کے ساتھ ہی میں آپ کی توجہ سوالات کی طرف دلاؤں گا۔ سوالات انتظامیہ کی نگرانی کا ایک مؤثر ترین ذریعہ ہیں۔ اس کے بارے میں پوزیشن یہ ہے کہ اوسطاً تقریباً ۱۹۰۰ سے ۲۰۰۰ سوالات ہر سال آتے ہیں۔ لیکن عملاً جو جوابات آئے وہ ان سوالات کا صرف

۳۵ فیصد ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جو سوالات آپ نے وصول کیے ان میں سے تقریباً ۲۰ فیصد قبول نہیں ہوئے۔ جو ۸۰ فیصد قبول ہوئے ان میں سے بھی صرف ۳۵ فیصد جوابات آئے ہیں۔ یہ بہت سنجیدہ غلطی اور لاپروائی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس معاملے میں ہمیں اپنے کردار کو درست کرنا چاہیے اور حکومت کو بھی ترغیب دینی چاہیے کہ وہ بروقت جواب دے۔ نئے رولز میں بلاشبہ ہم نے اس سلسلے میں بہتری کی ہے لیکن اصل چیز عملدرآمد ہے محض قواعد کو بنا کر رکھنا نہیں ہے۔

التواء اور استحقاق کی تحریکات اور توجہ دلاؤ نوٹس پر عدم توجہ: جناب چیئرمین! اس کے بعد تحریکِ استحقاق ہے۔ یہ کہتے ہوئے ایک طرح سے دکھ ہوتا ہے کہ یہ وہ کیٹیگری ہے جس میں برابر ترقی ہو رہی ہے۔ ۱۰-۲۰۰۹ء میں ۳۱ تحاریکِ استحقاق آئیں جو ۰۹-۲۰۰۸ء کے مقابلے میں زیادہ ہیں، پہلے وہ ۲۵ تھیں ان میں اضافہ ہوا ہے۔ اور اس سال تو معلوم ہوتا ہے کہ تحاریکِ استحقاق کی فصل بہار رہی ہے، چنانچہ ۱۱-۲۰۱۰ء میں ۶۱ تحاریک استحقاق آئیں جن میں سے بیشتر کا تعلق چھوٹے چھوٹے ذاتی مسائل سے تھا۔ اس پر بھی ذرا غور کرنے کی ضرورت ہے۔

جنابِ والا! تحاریکِ استحقاق کے بعد توجہ دلاؤ نوٹسز کے بارے میں، میں آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ ۱۰-۲۰۰۹ء میں ۹۳ بحث کے لیے آئے لیکن ان ۹۳ میں سے صرف آٹھ پر بحث ہو سکی۔ ۱۱-۲۰۱۰ء میں توجہ دلاؤ نوٹسز ۱۰۲ آئے لیکن ان میں سے صرف تین پر بحث ہو سکی۔ جنابِ والا! میرا خیال ہے کہ یہ ہماری کارکردگی کی کوئی اچھی مثال نہیں ہے۔

جنابِ والا! تحاریکِ التواء کے بارے میں یہ عرض کروں گا کہ ۱۰-۲۰۰۹ء میں ۱۸۲ اراکین نے تحاریکِ التواء دیں جن میں سے گیارہ ایوان میں پیش ہوئیں اور صرف تین پر بحث ہوئی۔ یہی کیفیت تقریباً ہر سال رہی ہے۔ اس موقع پر میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ اس وقت بھی جبکہ ہمارا سال مکمل نہیں ہوا ہے اس میں ۱۷ تحاریک بحث کے لیے منظور ہو چکی ہیں۔ لیکن ان پر بحث نہیں ہوئی ہے۔ ان میں سے چھ ایسی ہیں جن میں میں خود یا جماعت اسلامی کے میرے دوسرے ساتھی مجوز تھے۔ ٹھیک ہے وہ ہماری رکنیت کے ساتھ

ختم ہو جائیں گی لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس موقع پر آپ لوگوں کو یہ یاد دلاؤں کہ یہ کرنے کے کام ہیں۔ ہم نے محض مباحثے کی انجمن نہیں بننا ہے۔ ہمیں ان چاروں ذمہ داریوں کو ادا کرنا ہے جو دستور نے ہمارے سپرد کی ہیں اور مؤخر شدہ کام پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

قومی مسائل پر توجہ کی ضرورت

جنابِ والا! اس کے بعد چند اور نکات پیش کرنے کے لیے میں آپ کی اجازت چاہوں گا کہ میری نگاہ میں اس وقت سینیٹ، پارلیمنٹ، حکومت اور قوم کے سامنے سب سے اہم مسائل کیا ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی بات اسی پر ختم کروں کہ ان مسائل کی طرف توجہ دینا اصل امتحان ہے اور اس میں اگر ہم نے کوتاہی برتی تو تاریخ ہمیں معاف نہیں کرے گی۔

قومی آزادی اور خود مختاری کی حفاظت: سب سے پہلا مسئلہ میری نگاہ میں ملک کی آزادی، اس کی حاکمیت، اس کی خود مختاری اور اس کی عزت اور وقار کا تحفظ ہے۔ اس پر پچھلے ۱۲ سالوں میں جو چرکے لگے ہیں اور جو ہزیمتیں ہمیں اٹھانی پڑی ہیں، جس طرح ڈرون حملے ہوئے اور جس طرح ہمیں دنیا بھر میں بلیک میل کیا گیا ہے، دباؤ ڈالا گیا ہے حتّٰی کہ ریمنڈ ڈیوس جیسا واقعہ اور پھر ۲ مئی اور ۲۶ نومبر کا واقعہ بھی رونما ہوا ہے[1]، یہ سب نہایت تشویشناک ہے۔ جنابِ والا! ہماری آزادی خطرے میں ہے۔ جو قوم اپنی آزادی کھو دے وہ پھر زندہ رہنے کے لائق نہیں ہوتی۔ اس لیے ہمارا سب سے پہلا مسئلہ آزادی کا تحفظ ہے۔ اس کے لیے جو بھی قیمت ادا کرنا پڑے وہ ادا کریں کیونکہ قومیں اگر اپنی آزادی کے لیے قیمت ادا نہ کریں تو وہ پھر محکوم اور غلام بن کر رہتی ہیں۔ مجھے اس وقت جوش ملیح آبادی کا ایک قطعہ یاد

---

[1] ۲۶ جنوری ۲۰۱۱ء کو امریکی بلیک واٹر تنظیم کے اہل کار ریمنڈ ڈیوس نے لاہور میں دو پاکستانیوں کو فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا۔

۲ مئی ۲۰۱۱ء کو القاعدہ کے سربراہ اسامہ بن لادن کو ہدف بنانے کے لیے امریکی طیاروں نے پاکستانی سرزمین پر براہ راست حملہ کیا۔

۲۶ نومبر ۲۰۱۱ء کو پاک افغان سرحد پر مہمند کے علاقے میں پاکستانی چیک پوسٹ سلالہ پر نیٹو ہیلی کاپٹر سے حملہ کر کے ۲۸ پاکستانی فوجیوں کو جن میں دو افسران بھی شامل ہیں شہید کر دیا گیا تھا۔

آرہا ہے جس میں جوش نے کہا تھا کہ ؎

عشق و آزادی بہار زیست کا سامان ہے
عشق میری جاں آزادی میرا ایمان ہے
عشق پر کردوں فدا میں اپنی ساری زندگی
لیکن آزادی پر میرا عشق بھی قربان ہے

جنابِ والا! یہی آزادی کی اہمیت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ پہلا مسئلہ ہے جس کا ہمیں تحفظ کرنا چاہیے۔

ملکی نظریاتی شناخت کی اہمیت: دوسرا مسئلہ میری نگاہ میں ملک کی نظریاتی شناخت ہے۔ ہمارا ملک ایک نظریاتی ملک ہے۔ جنابِ والا! ہم نے اس ملک کو قائم کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کی ہے اور بڑی قربانیاں دی ہیں۔ مسلمانانِ ہند و پاک نے کروڑوں کی تعداد میں ہجرت کی ہے اور جانیں دی ہیں اور یہ سب اس لیے تھا کہ ہم اپنے دین، اپنے عقیدے اور اپنی تاریخ کی روشنی میں اپنی زندگی کو ترتیب دے سکیں۔ قائداعظمؒ نے سو سے زائد تقاریر ۱۹۳۹ء سے لے کر ۱۹۴۸ء تک اس بارے میں کی ہیں جن کا سارا ریکارڈ موجود ہے۔ ان میں کہیں بھی انہوں نے نظریات پر مصالحت نہیں کی ہے۔

پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے اور اس کو اسی حیثیت سے ہم نے آگے بڑھانا ہے لیکن آج ہمارا نظریاتی تشخص مجروح ہو رہا ہے۔ اپنے نظریات پر معذرت کی روش اختیار کی جا رہی ہے۔ ایسی باتیں آرہی ہیں جن کو دیکھ کر اور پڑھ کر افسوس ہوتا ہے۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے تحریک پاکستان میں الحمدللہ حصہ لیا ہے اور ایک طالب علم کی حیثیت سے، اس جدوجہد میں، میں نے اور میری فیملی نے قربانیاں دی ہیں۔ آج جب میں ان چیزوں کو دیکھتا ہوں تو میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔

جنابِ والا! اس لیے میں آج کے اس خطاب میں پاکستان کی نظریاتی شناخت اور اس کے اصل مقصد پر بھی، جو اسلامی اور فلاحی ریاست کا قیام ہے، بات کروں گا۔

قومی اخلاقی انحطاط کا مسئلہ: جنابِ والا! اس تسلسل میں تیسری چیز اخلاقی کیفیت سے متعلق ہے۔ مجھے دکھ سے کہنا پڑ رہا ہے کہ پہلی دونوں چیزوں کے بعد جس مسئلے کو سب سے زیادہ اہمیت دے رہا ہوں وہ دوسرے سیاسی اور معاشی مسائل نہیں بلکہ ملک میں روز بروز بڑھنے والا اخلاقی انحطاط ہے۔ اخبار اٹھا کر دیکھیے کہ چھوٹے چھوٹے بچوں، بچیوں، عورتوں اور مجبور انسانوں کے ساتھ کس طرح ظلم کیا جا رہا ہے۔ وڈیروں، زمینداروں اور با اثر افراد کے پرائیویٹ جیل خانے موجود ہیں۔ معاشرہ کو کس طرح تقسیم کر دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس قوم کی اخلاقی حس مردہ ہو جائے وہ پھر قوم کہلانے کی لائق نہیں رہتی۔ اس لیے ہمیں اس اخلاقی مسئلے کو بھی دیکھنا چاہیے۔ یہ محض حکومت کی ذمہ داری نہیں ہے۔ ہم میں سے ہر ہر فرد کی ذمہ داری ہے۔ قرآن صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ ہر فرد سے بحیثیت فرد احتساب اور پوچھ گچھ ہو گی۔ پھر اس میں میڈیا، تعلیمی نظام، والدین اور خاندان، معاشرے کے بزرگ، مسجد اور منبر، ان سب کی ذمہ داری ہے۔ جنابِ والا! ہمیں ملک کی اخلاقی قوت کو بڑھانا، اخلاقی حالات کو بہتر کرنا اور یہ دیکھنا ہے کہ ہم کہاں تک خیر اور شر کے درمیان فرق کر رہے ہیں۔ مجھے یہ کہنے دیجیے کہ مسلمان اور غیر مسلم میں یہ فرق نہیں ہے کہ ان کی شکل ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ وہی دو آنکھیں، وہی دو کان، وہی ایک ناک، وہی زبان اور وہی ہاتھ پاؤں دونوں کے ہوتے ہیں۔ فرق کیا ہے؟ فرق یہ ہے کہ مسلمان ایک اخلاقی معیار کو شعوری طور پر قبول کرتا ہے اور یہ عہد کرتا ہے کہ میں اپنی آخری سانس تک ان اخلاقی اقدار کی پاسبانی کروں گا۔ اگر ہم یہ پاسداری نہیں کر رہے ہیں تو ہم دنیا میں ناکام ہوں گے اور آخرت میں بھی ناکام ہوں گے۔ چنانچہ جنابِ والا! تیسری چیز جس کی طرف میں آپ کو متوجہ کروں گا وہ ملک کی اخلاقی تعمیر ہے۔

عوام کے بنیادی حقوق کی حفاظت: اس کے ساتھ چوتھی بات جو بہت ضروری ہے وہ بنیادی حقوق کا مسئلہ ہے۔ بنیادی حقوق جیسا کہ نبی پاک ﷺ نے اپنے آخری خطبے میں ذکر فرمایا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بحیثیت مجموعی ہماری تاریخ میں خامیاں اور کوتاہیاں رہی ہیں لیکن مسلمان ہو یا غیر مسلم، طاقتور ہو یا کمزور، حقوق کی پاسداری ہمارا حصہ رہی ہے۔ آج

جو صورت حال ہے وہ نا قابلِ برداشت ہے۔ لا قانونیت ہے، لاپتا افراد کا مسئلہ ہے، ہماری بیٹی ڈاکٹر عافیہ صدیقی دوسروں کے قبضے میں ہے اور ہم اسے نہیں لا سکتے۔ خود یہاں مسخ شدہ لاشیں آرہی ہیں۔ ہر روز یہ واقعات سامنے آتے ہیں کہ فلاں کا بیٹا یا اس کا بھائی اٹھا لیا گیا ہے اور پھر اب تو عورتوں کو بھی اس میں بخشا نہیں جارہا۔ جنابِ والا! یہ انسانی حقوق کا مسئلہ بھی بہت اہم ہے اس لیے میں اس مسئلے کو بھی آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔

معاشی صورتحال: جنابِ والا! پانچواں نکتہ، معیشت کی صورت حال سے متعلق ہے جو اتنی خراب کبھی نہیں ہوئی تھی جتنی آج ہے۔ غربت بڑھی ہے، بے روزگاری بڑھی ہے اور چار سال کے اندر قرضے دگنا ہو گئے ہیں۔ Standard & Poor's کی جو رپورٹ پرسوں آئی ہے اس نے کہا ہے کہ پاکستان ایشیا کا سب سے زیادہ مہنگا ملک ہے جس میں قیمتوں میں اضافہ اور افراطِ زر ہے۔ آج بھی جو رپورٹ آئی اس میں صاف معلوم ہو رہا ہے کہ بین الاقوامی طور پر ہماری ساکھ ہر روز نیچے جارہی ہے۔ جنابِ والا! اس کو سنجیدگی سے لیجیے اور اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کیجیے۔

جنابِ والا! اگلا مسئلہ کرپشن کا ہے جس کے بارے میں میرے دوسرے ساتھیوں نے بھی بہت کچھ کہا ہے۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں جاتا لیکن یہ ایک سنجیدہ مسئلہ ہے۔ پھر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قومی حیثیت سے ہماری بقاء کے لیے دو قسم کی سیکورٹی بہت ضروری ہے۔ ایک فوڈ سیکورٹی اور دوسری انرجی سیکورٹی۔ یہ دونوں اس وقت نہیں ہیں۔ اس کے لیے فوری طور پر درمیانی اور طویل مدتی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔

بلوچستان کا مسئلہ: جنابِ والا! اگلا مسئلہ بلوچستان کا ہے۔ یہ صرف بلوچوں کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ میرا، آپ کا، پورے ملک کا اور ہر طبقے کا مسئلہ ہے۔ خدا کے لیے اس کو اہمیت دیجیے۔ فوری طور پر کوشش کیجیے کہ جو اصل اور حقیقی مسائل ہیں ان کا سامنا کیا جائے۔ لوگوں کو مذاکرات پر بلایا جائے اور انہیں احساس شرکت اور احساس ملکیت دیا جائے۔ میں آپ سے یقین سے کہتا ہوں کہ حالات کتنے ہی بگڑے ہوں درست حکمت عملی کے ساتھ انہیں بہتر بنانے کے لیے ہر چیز ممکن ہے لیکن یہ چیلنج بہت بڑا ہے اور اس کو پورا کرنا بہت ضروری ہے۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ: جنابِ والا! اس کے ساتھ ساتھ دہشت گردی کا مسئلہ ہے اور خاص طور پر جب تک امریکہ کی افغانستان میں جاری جنگ ختم نہیں ہوتی یہ ہم پر مسلط رہے گی۔ امریکہ نے افغانستان اور عراق پر قبضہ کیا ہے اور پاکستان بھی بالواسطہ اس کے قبضے میں ہے۔ جنابِ والا! یہ بات میں نہیں کہہ رہا بلکہ رابرٹ پاپ(Robert Pape)، شکاگو یونیورسٹی کا پروفیسر ہے، جس کی تازہ ترین کتاب Cutting the Fuse چند ماہ پہلے آئی ہے اس میں اس نے یہی بات کہی ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ افغانستان امریکہ کے قبضے میں اور پاکستان بالواسطہ قبضے میں ہے۔ دہشت گردی کی جنگ کو ختم کرنا، افغانستان کے ساتھ معاملات کو سلجھانا، وہاں مداخلت کی بجائے قومی مصالحت، باہمی اعتماد اور خطے کے تمام ممالک کو شریک کر کے مسائل کا حل نکالنا ضروری ہے۔

مشرف دور کا محاسبہ: جنابِ والا! آخری معاملہ جس کے بارے میں کچھ کہنا میں ضروری سمجھتا ہوں وہ ہے مشرف دور کا احتساب۔ جو مظالم اس شخص نے کیے ہیں دستور کی خلاف ورزی کے اعتبار سے، انسانی حقوق کے اعتبار سے، ملک کو ایک جنگ میں ڈال کر، اکبر بگٹی جیسے پاکستانی کو ظالمانہ طور پر شہید کرنا، لال مسجد میں جو کچھ کیا اس کا احتساب ضروری ہے۔ حقائق کی تلاش و تسلیم اور قومی مصالحت وقت کی ضرورت ہے لیکن اس دور کی روشنی میں احتساب کرنا از حد ضروری ہے۔

نامکمل کاموں کی تکمیل ایوان کی ذمہ داری: آخری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے اور میرے ساتھیوں نے بہت سے قوانین یہاں پر متعارف کرائے ہیں جو ابھی مکمل نہیں ہو سکے ہیں لیکن وہ بڑے اہم ہیں۔ اس میں دستوری ترمیم شامل ہے۔ لاپتا افراد کے بارے میں قانون ہے۔ اس میں صحافیوں کے حقوق کا مسئلہ ہے اس میں بے روزگار اور معذور افراد کی مدد کرنے کا مسئلہ ہے اور اس میں مہنگائی کنٹرول کرنے کا مسئلہ ہے۔ پانچ یا چھ قوانین ایسے ہیں جو ہم نے متعارف کرائے ہیں۔ ایک قانون صحافیوں سے متعلق ہے اس میں مسلم لیگ کے ساتھیوں نے شراکت کی ہے وہ جاری رہے گا۔ میرے علم کی حد تک پارلیمانی روایات یہ ہیں کہ ایک مرتبہ جو

قانون متعارف ہو گیا وہ ایوان کی ملکیت ہے۔ اگر اسے متعارف کرانے والا ممبر ایوان کا ممبر نہیں بھی رہتا تب بھی ایوان کا فرض ہے کہ وہ اس پر غور کرے، اسے قبول کرے یا رد کرے۔ لیکن میں چاہوں گا کہ میرے دوسرے ساتھی اس کو متعارف کرانے میں شرکت کریں اور اس ایجنڈے کو مکمل کیا جائے۔

ذاتی کوتاہیوں پر معذرت

آخر میں، میں ایک بار پھر سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن میں اپنی بات کو مختصراً ختم کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ میں اس پوری بحث کو سنتا رہا ہوں اور تمام جماعتوں سے متعلق میرے معزز بھائیوں اور بہنوں نے جس طرح میرا ذکر کیا، جہاں میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں وہیں حقیقت یہ ہے کہ میں بڑی شرمندگی بھی محسوس کرتا ہوں کہ میں حق ادا نہیں کر سکا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اگر کوئی کوتاہی اس پورے دور میں میری طرف سے رہی ہو، یا میرے کسی بھی ساتھی کو جو انتظامیہ میں ہیں یا اراکین کو کسی اعتبار سے میری کسی بات سے دکھ پہنچا ہو تو میں یقین دلاتا ہوں کہ وہ میری نیت کبھی نہیں تھی اور میں ان سے معذرت خواہ ہوں۔ اگر میری وجہ سے انہیں کوئی تکلیف پہنچی ہو تو توقع ہے کہ وہ فراخدلی سے مجھے معاف کریں گے۔

آخر میں، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ الحمدللہ پاکستان میں جمہوریت ہے اور میں اس ایوان کے مستقبل کے لیے بہت پرامید ہوں۔ اگرچہ حالات کا حقیقت پسندانہ جائزہ بھی ضروری ہے تاکہ ہم کسی غلط فہمی میں نہ رہیں، دوسری طرف امید رکھنا ایمان کا تقاضا ہے۔ یہ تاریخ کا فیصلہ ہے اور میں اس پر بات ختم کرنا چاہتا ہوں۔

یوں اہل توکل کی بسر ہوتی ہے
ہر لمحہ بلندی پر نظر ہوتی ہے
گھبرائیں نہ ظلمت سے گزرنے والے
آغوش میں ہر شب کے سحر ہوتی ہے

(۹ مارچ ۲۰۱۲ء)

اشاریہ

آ

آبادی، ۷۰
آبپاشی، ۷۰
آخری خطبہ، ۱۸۷
آرڈیننس، ۶، ۷۲، ۱۱۳، ۱۲۹، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۱، ۱۸۳
آرڈیننس پبلک سروس کمیشن کی تنظیم نو، ۱۳۸
آزاد اراکین، ۲۵، ۳۴، ۴۰، ۴۲، ۵۲، ۵۳، ۵۴
آزاد اراکین کی حیثیت، ۴۰
آزاد خارجہ پالیسی، ۸۵، ۱۱۰
آزادی کا تحفظ، ۶۸
آغازِ حقوقِ بلوچستان، ۹۷، ۱۰۳، ۱۱۳، ۱۲۵
آکسفورڈ، یونیورسٹی، ۱۵
آئی ایم ایف، ۸۷، ۱۰۹، ۱۱۱، ۱۵۹
آئین کا تقدس، ۱۰۲/ آئین کی ۸ ویں ترمیم کی شق ۵۸ (۲) (بی)، ۳/ آئینی استثنیٰ، ۹۷/ آئینی انحراف، ۲۳، ۲۵، ۹۳/ آئینی انحراف، ۲۴
آئینی ترمیم آٹھویں، ۱۸/ ۱۴ ویں، ۴۸، ۴۹/ ۱۷ ویں، ۱۰، ۱۷، ۱۸، ۴۸، ۴۹، ۶۲، ۸۳، ۹۹/ ۱۸ ویں، ۳۱، ۴۸، ۹۷، ۱۰۲، ۱۰۴، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۴۹، ۱۷۹
آئین ۱۹۷۳ء، ۸۱

ا

اپوزیشن لیڈر، ۲۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۵۰، ۵۳، ۵۶، ۱۵۹
اپوزیشن لیڈر کی تقرری، ۳۲
اتر پردیش، ۱۵۵
اٹارنی جنرل، ۱۰۵
اجتہاد، ۶۴
احتساب، ۷، ۱۷، ۵۹، ۷۵، ۸۴، ۹۴، ۱۰۱، ۱۲۵، ۱۴۱، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۸۲، ۱۸۷، ۱۸۹/ احتساب آرڈیننس، ۱۴۱/ احتساب بیورو، ۷۵/ احتسابی عدل، ۸۴
اختیارات کی نچلی سطح پر منتقلی، ۵۹
اخلاقی انحطاط، ۱۸۷
ارسکن مے (Erskine May)، ۴۲، ۴۵، ۱۴۸، ۱۵۳، ۱۵۵، ۱۵۶
ارمغان خورشید سیریز، ۱۶۷
اروند پی دتار (Arvind P. Datar)، ۱۳۲
اسامہ بن لادن، ۱۸۵
استعماری گرفت، VI
استعماری نظام کے شکنجے، V
اسپیکر کی رولنگز، ۳۸
اسپین، ۹۰
استحقاق کا قانون، ۱۷۴
اسٹاف ویلفیئر فنڈ، ۱۷۹
اسٹاک ایکسچینج، ۶
اسٹریچک آلات، ۸۶
اسٹیفن ریخ، ڈاکٹر، ۱۹۱
اسٹیون ہیڈلی، قومی سلامتی کے مشیر، ۹۴
اسرائیل، ۷۶
اسلام، ۱۲، ۲۹، ۳۱، ۵۷، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۱۰۴، ۱۳۶

اسلام آباد میں صارفین کا تحفظ، ۱۳۶
اسلام آباد ہائی کورٹ، ۱۰۴
اسلامی جمہوریت، ۶۲
اسلامی صارفین کا تحفظ، ۱۳۶
اسلامی فلاحی ریاست کا قیام، ۶۳، ۱۸۶
اسلامی نظریاتی کونسل، ۱۷۱
اصلاح معاشرہ، ۱۷۱
اطلاعات کی آزادی کا قانون، ۸۴
اعتدال کا مذہب، ۶۳
اعلیٰ تعلیمی کمیشن، ۱۰۲
اعلیٰ عدلیہ کے ججوں کی ریٹائرمنٹ کی عمر، ۱۸
افتخار اللہ بابر (سیکرٹری)، ۱۷۸
افراطِ زر، ۶۶، ۱۰۹، ۱۲۲، ۱۸۸
افغانستان، ۵۹، ۶۷، ۷۷، ۷۹، ۸۱، ۹۵، ۱۱۱، ۱۱۵، ۱۲۳، ۱۸۹
اقبال، علامہ، محمد، ۶۳
اقتصادی بدحالی، ۸۶
اقتصادی مذاکرات، ۱۲۰
اقوام متحدہ کا چارٹر، ۷۷
اقوام متحدہ کی قرار دادیں، ۷۸
الہامی ہدایت، V، VI
البقرۃ (سورۃ)، ۱۱
اٰل عمرٰن (سورۃ)، ۳۷
النساء (سورۃ)، ۳۶، ۶۵
الفاروق، ۶۶
القاعدہ، ۱۸۵
المائدہ (سورۃ)، ۶۵
الیکشن ۱۹۳۷ء، ۷۹ / الیکشن کمیشن، ۵۵، ۸۴ / الیکشن کے قواعد وضوابط، ۶
امتِ مسلمہ، ۱۵
امبیڈکر، ڈاکٹر، ۱۳۲
امریکہ، ۱۰، ۶۳، ۷۴، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۵، ۸۶، ۸۹، ۹۴، ۹۶، ۱۰۷، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۶۴، ۱۸۹ / امریکہ کی پالیسیاں، ۱۱۸، ۱۲۳
امریکہ کا ترجمان، ۸۵ / امریکہ کی سینٹرل کمانڈ، ۸۹ / امریکہ کی سینیٹ کی کمیٹی، ۱۰۷ / امریکہ کی غلامی، ۱۲۴ / امریکی اخبارات، ۱۱۱
امریکی ایجنسیوں کی مداخلت، ۱۱۷
امریکی تاریخ، ۱۱۱
امریکی سفیر، ۱۲۱
امریکی کارروائیاں، ۹۴ / امریکی مداخلت، ۱۱۷
امن وامان کی بحالی، ۱۱۵
امورِ خارجہ، ۸۶
امونیا کھاد، ۱۱۲
امیگریشن کے قوانین، ۱۶۴
انتخابی عمل، VII / انتخابی کالج، ۷، ۱۰، ۱۴، ۱۸ / انتخابی نظام، VII
انٹرپارلیمنٹری یونین، ۵۲
انتہاپرست، ۶۴
انتہاپسندی، ۵۹، ۶۷، ۷۶، ۸۱، ۸۷، ۱۱۵
اندرون ملک بے گھر افراد، ۱۱۰
انڈین پارلیمنٹ، ۴۲
انرجی سیکورٹی، ۱۸۸
انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، VI، IX
انسانی حقوق کا بین الاقوامی اعلان، ۷۷
انسانی وسائل کی ترقی، ۸۷
انسانیت کے ارتقا، V
انگلستان، ۴۷
انگور اڈا (وزیرستان)، ۹۴، ۹۵
انور (سیکرٹری)، ۱۷۸
او جی ڈی سی ایل، ۱۲۶
اے پی ڈی ایم، ۹، ۱۰

ایٹمی ڈاکٹرائن، ۶۳ / ایٹمی صلاحیت کی حفاظت، ۷۷ / ایٹمی ہتھیاروں کا پھیلاؤ، ۵۹
ایڈمرل مولن امریکی جوائنٹ چیف آف اسٹاف، ۱۱۱
ایشیا، ۱۸۸
ایک ملک دو نظام، ۴۶
ایکس کیڈر (Ex-Cadre)، ۱۷۲
ایکسائز ڈیوٹی، ۱۵۹
ایگزٹ کنٹرول لسٹ، ۷۵
ایل ایف او (LFO)، ۱۸، ۱۴۰، ۱۶۴
ایم ایم اے (متحدہ مجلس عمل)، ۸، ۹، ۱۰، ۱۷، ۱۸، ۲۰، ۵۰
ایم کیو ایم (متحدہ قومی موومنٹ)، ۳۱، ۳۵
ایم آر ڈی، ۱۲
ایمپلائز ویلفیئر فنڈ، ۱۷۱
این ایف سی ایوارڈ، ۹۷
این آر او، ۸۹، ۹۱، ۱۴۱
ایوانِ صدر، ۳، ۱۶، ۷۳، ۸۹، ۱۰۳، ۱۱۸
ایوان کی توہین، ۱۴۸، ۱۵۳، ۱۵۶، ۱۵۷

ب

بابر صاحب (سیکرٹری)، ۱۴۵
باجوڑ ایجنسی، ۱۴۶
بادشاہ، ۱۷۰
بار کونسل، ۷۳
باراک اوباما (Barack Obama)، امریکی صدر، ۱۲۳
بجلی کا بحران، ۱۲۷ / بجلی کی پیداوار، ۱۳۶
بحالی جمہوریت، ۵۹، ۶۱
برصغیر، ۹۸، ۱۷۰
برطانوی پارلیمنٹ، ۴۲، ۹۸، ۱۴۸، ۱۷۰، ۱۷۴، ۳۴
برطانوی چیف آف اسٹاف، ۱۲۱
برطانوی دور، ۱۷۰ / برطانوی سفراء، ۱۲۱
برطانیہ، ۳۴، ۴۱، ۹۰، ۱۲۵، ۱۴۷، ۱۸۳
برطانیہ کی پارلیمانی تاریخ، ۴۱
بریٹ اسٹیفن (صحافی)، ۹۳
بزنس کمیٹی، ۵۰، ۱۴۳
بش (George W. Bush)، امریکی صدر، ۶۷، ۸۰، ۹۵
بلیک واٹر تنظیم، ۱۱۷، ۱۸۵
بلیکس لاء ڈکشنری Black's Law Dictionary، ۳۹
بلوچ سیاسی کارکنوں کا قتل اور ٹارگٹ کلنگ، ۱۱۳
بلوچستان، ۵۳، ۸۱، ۹۷، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۲۵، ۱۸۸
بلوچستان اسمبلی، ۱۱۳
بلوچستان لوکل گورنمنٹ آرڈیننس ۲۰۰۱ء، ۱۱۳
بنیادی حقوق کا مسئلہ، ۱۸۷
بوسٹن، ۱۱۰ / بوسٹن کی تحقیقی رپورٹ، ۱۱۰
بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام، ۱۳۶
بے نظیر بھٹو (وزیر اعظم)، ۵، ۸۹، ۹۰، ۱۰۵
بھٹو، ذوالفقار علی، پیپلز پارٹی کے بانی، ۱۶، ۹۱
بیروزگاری، ۶۷
بین الاقوامی عدالت انصاف ہیگ، ۱۲۳
بین الاقوامی قوانین، ۱۳۹
بیوروکریسی کا نظام، ۱۰۸
بھارت (انڈیا)، ۴۱، ۴۲، ۴۷، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۸۱، ۹۳، ۱۱۵، ۱۱۷، ۱۴۷، ۱۸۲ / بھارت سے تعلقات، ۷۷ / بھارت کی راجیہ سبھا، ۱۸۲ / بھارتی آئین، ۴۴، ۱۳۲ / بھارتی گروہی سیاست، ۴۴
بھارت کے دستور پر تبصرہ Commentary on the Indian Constitution، ۱۳۲

پ

پارٹی سسٹم، ۵۲
پارٹی سے اختلاف کی حدود، ۱

پارلیمانی تاریخ، ۴۱، ۴۶، ۴۸، ۱۴۶، ۱۷۰/ پارلیمانی جمہوریت، ۱۹، ۴۶، ۵۲/ پارلیمانی روایات، ۲۲، ۵۶، ۵۷، ۶۰، ۶۱، ۱۴۴، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۸۹
پارلیمانی قواعد و ضوابط، ۵۷/ پارلیمانی نظام، ۴۵، ۵۵، ۶۲، ۸۰، ۸۴، ۱۷۰/ پارلیمانی سال، ۵۷، ۹۸، ۹۹/ پارلیمانی عمل، ۴۶
پارلیمنٹ کا حق، ۷۷، ۱۳۲/ پارلیمنٹ کا کردار، ۷۱، ۱۸۱/ پارلیمنٹ کی بالادستی، ۶۲، ۱۰۲، ۱۳۴
پارلیمنٹری پریکٹس، ۱۵۳، ۱۵۵
پاک افغان سرحد، ۱۸۵
پاک ہند تعلقات، ۱۷۳
پاک امریکہ تعاون، VI
پاکستان اکنامک سروے، ۱۰۸
پاکستان ایک نظریاتی ملک، ۱۸۶
پاکستان پٹرولیم آئل اینڈ گیس، ۱۱۴
پاکستان سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن، ۷
پاکستان سٹڈی سنٹر پنجاب یونیورسٹی لاہور Pakistan Study Centre Punjab University Lahore، ۱۸
پاکستان سول سروس، ۱۲
پاکستان کا متعصب معاشرہ، ۶۷
پاکستان کا استحکام، ۱۵
پاکستان بار کونسل، ۷۳
پاکستان کی پارلیمانی تاریخ، ۱۷۰
پاکستان کی تاریخ، ۸، ۶۷، ۷۲، ۷۳، ۱۰۱، ۱۷۰
پاکستان کی خود مختاری، ۸۵
پاکستان کی سیاسی صورتحال، IX
پاکستان کی سلامتی، ۶۸
پاکستان کی معیشت، ۸۹، ۱۱۰
پاکستان کی نظریاتی اساس، VI
پاکستان لائرز فورم، ۱۱۸
پاکستان مسلم لیگ (ق)، ۷، ۱۷، ۲۱، ۳۱، ۳۴، ۳۵، ۴۸، ۵۰، ۵۱، ۵۵، ۲۰، ۸۳
پاکستان مسلم لیگ (ن)، ۲۵، ۲۹، ۳۱، ۳۴، ۵۰، ۸۳
پاکستان نیشنل پارٹی، ۲۰
پاکستانی چیک پوسٹ سلالہ، ۱۸۵
پالیسی کا جائزہ، ۷۴/ پالیسیوں کی تشکیل، ۶۰، ۷۴
پبلک اکاؤنٹس کمیٹی، ۸۱
پٹرول کی قیمتیں، ۱۳۹
پختونخوا ملّی پارٹی، ۲۰
پرائیویٹ جیل خانے، ۱۸۷
پرائیویٹائیزیشن آف بنکس، ۱۷۱
پرنٹ میڈیا، ۱۷۸
پروڈکشن آرڈر، ۱۵۱
پریڈیٹرز، ۸۵
پشین، ۱۱۴
پنٹاگون، ۱۱۱
پلڈاٹ PILDAT، ۱۸۲، ۱۸۳
پنجاب، ۲۸، ۱۰۲، ۱۰۸/ پنجاب کی حکومت، ۱۰۸
پورٹ اتھارٹی، ۱۱۴
پولیس، ۱۸، ۶۶، ۷۰، ۸۸، ۱۱۳
پی آئی اے، ۱۲۶
پی پی کا دور حکومت، ۹۷
پی سی او، ۲۲
پیپلز پارٹی (پاکستان پیپلز پارٹی)، ۷، ۱۲، ۱۶، ۱۹، ۲۱، ۲۶، ۲۹، ۳۱، ۳۲، ۸۳، ۸۷، ۹۱، ۹۳، ۹۴، ۱۰۵، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۵۱، ۱۵۹
پیو Pew، ۱۱۷، ۱۲۰
پی ٹی سی ایل، ۱۳۹

ت

تانبا، ۱۱۲

تاریخی قراردادیں، ۱۷۲
تجارت کا خسارہ، ۲۵
تحریکِ استحقاق، ۱۳۱، ۱۶۴، ۱۷۵، ۱۸۴
تحریکِ التواء، ۹۱، ۱۲۹، ۱۴۳، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۹، ۱۸۱
تحریکِ پاکستان، ۷۹، ۱۸۶
تشدد کا خاتمہ، ۱۱۵
تعلیم کا مسئلہ، ۱۰۱
تعلیم کا نظریاتی پہلو، ۷۵
تعلیمی بجٹ، ۱۰۲ / تعلیمی پالیسی، ۷۵، ۷۹، ۱۰۱
تہذیبی تعلیم، ۷۵
توانائی بحران، ۱۰۹، ۱۱۵
توجہ دلاؤ نوٹس، ۱۲۹، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۶، ۱۸۴
تین نومبر کا اقدام، ۲۴
تیل، ۱۱۲، ۱۱۴

ٹ

ٹارگٹ کلنگ، ۷۸، ۱۱۳، ۱۲۵
ٹائمز اسکوائر نیویارک، ۱۱۱
ٹائمز ویکلی Times Weekly، ۸۹
ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل، ۶۶، ۸۸، ۱۰۶
ٹریڈ یونین پر پابندی، ۸۱
ٹیکس کے نظام میں کمزوریاں، ۱۱۵ / ٹیکسیشن سسٹم ریفارمز، ۱۷۱
ٹیکنالوجی تعلیم، ۷۵

ج

جان محمد جمالی (ڈپٹی چیئرمین سینیٹ)، ۱۹، ۲۵
ججوں کی بحالی، ۲۲، ۲۶، ۲۹
جدت پسند، ۶۳، ۶۴ / جدید اسلام، ۶۳ / جدیدیت پر مائل اسلام، ۶۳
جسٹس سلیم اختر، ۱۳۳
جسٹس افضل میاں، ۱۳۳
جسٹس سجاد علی شاہ، ۱۳۳
جسٹس منیر، ۹
جسٹس وجیہہ الدین، ۷، ۹
جگ جیون رام، ۴۲، ۴۷
جلاوطنی، ۱۱۲
جماعت اسلامی، ۳۶، ۵۰، ۱۷۷، ۱۸۴
جماعتی جمہوریت، ۵۳
جمعیت علمائے اسلام (ف) (جے یو آئی)، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۵، ۳۶، ۵۱، ۵۳، ۵۶
جمہوری بنیاد، ۱۴ / جمہوری ادارے، ۱۴ / جمہوری تاریخ، ۸ / جمہوری ترقی، ۶۹ / جمہوری دفعات، ۱۷۲ / جمہوری رسومات، ۹ / جمہوری قوتوں کا ظہور، ۱۱۹ / جمہوری نظام، ۵، ۱۲۷
جمہوریت کا بنیادی اصول، ۹ / جمہوریت کا مسئلہ، ۶۱ / جمہوریت کی بحالی، ۶۱، ۶۲ / جمہوریت کی روح، ۱۷۱ / جمہوریت کی موت، ۱۰
جموں، ۷
جنرل آغا محمد یحییٰ خان، ۹۳
جنرل ایوب خان، ۶۸، ۹۱، ۹۱
جنرل پرویز مشرف، ۷، ۱۰، ۲۳، ۵۹، ۶۳، ۷۲، ۷۷، ۸۲، ۸۴، ۸۶، ۸۷، ۹۰، ۹۱، ۹۳، ۱۰۵، ۱۶۳، ۱۸۹
جنرل محمود درانی (سیکورٹی ایڈوائزر)، ۹۴
جنرل ضیاء الحق، ۱۲، ۹۳
جنرل عبدالوحید کاکڑ، ۳
جنرل ڈیوڈ پٹریاس، ۱۱۱
جنرل سیلز ٹیکس بل، ۱۵۹، ۱۶۱، ۱۶۲
جہادی گروپ، ۱۱۱
جوش ملیح آبادی، ۱۸۵
جوہری پروگرام، ۷۶ / جوہری دفاعی صلاحیت، ۷۶، ۷۹

جوہری ہتھیاروں کا پھیلاؤ، ۶۷
جی ڈی پی، ۸۸، ۱۰۱
جیک شیراک (Jacques Chirac)، ۵

چ

چوہدری شجاعت حسین (وزیر اعظم)، ۱۷، ۳۵، ۱۵۱، ۱۵۷
چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری، ۲۲، ۲۹، ۸۳، ۹۳، ۱۰۵
چیف آف آرمی اسٹاف، ۸
چینی قیادت، ۴۶
چیئرمین سینیٹ فاروق نائیک، ۱۹، ۲۵، ۳۱
چیئرمین سینیٹ وسیم سجاد، ۳، ۴، ۱۶، ۳۲، ۵۰، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۷۷
چیئرمین کی رولنگ، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۵، ۱۵۸
چھوٹے ڈیم، ۱۱۴

ح

حاجی عدیل، ۸۷
حافظ حسین احمد، ۱۷
حدیث، ۱۶۹
حسین حقانی، پاکستانی سفیر، ۸۶
حسین ہارون، ۹۱
حضرت آدم علیہ السلام، V
حضرت ابو عبیدہؓ، ۱۱
حضرت خالد بن ولیدؓ، ۶۵
حضرت عمر فاروقؓ، ۱۱، ۶۷، ۶۵
حضور پاک ﷺ، V، ۱۱، ۱۶۹، ۱۸۷
حقِ خود ارادیت، ۷۷
حقوقِ بلوچستان پیکیج، ۹۷، ۱۰۳، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴
حکومتِ پاکستان کا تنخواہ دار ملازم، ۸

خ

خارجہ کمیٹی کی رپورٹ، ۱۷۱
خروشچیف، ۷۹
خلفائے راشدین، ۱۰
خلیفہ، ۱۰، ۱۱
خنزیر، ۱۱
خواتین کی نظر بندی، ۱۳۶/ خواتین کی نمائندگی، ۱۷۳
خود مختاری، ۲۵، ۶۱، ۷۲، ۸۱، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۹۵، ۹۶، ۱۱۳، ۱۲۲، ۱۴۳، ۱۸۵
خود انحصاری، ۵۹، ۶۱، ۷۴، ۱۲۴
خوراک کا بحران، ۸۶

د

داخلہ پالیسی، ۱۱۰
دریائے فرات، ۶۷
درگا داس باسو (Durga Das Basu)، ۱۳۲
دستور، ۱۸/ دستور کی اسلامی دفعات، ۱۷۲/ دستور کی بحالی، ۱۷/ دستور کی معطلی، ۲۴/ دستور میں ترمیم، ۲۳/ دستوری انحراف، ۲۳/ دستوری مسائل، ۱۷۲
دفاعی بجٹ، ۸۱/ دفاعی طاقت، ۶۸
دنیا کی پارلیمان Parliaments of the World، ۵۲
دہری حاکمیت، ۶۲
دہشت گردی، VI، ۶۷، ۷۸، ۸۱، ۸۵، ۹۷، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۵، ۱۱۷، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۸۹/ دہشت گردی کا مسئلہ ۱۸۹،
دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ، ۹۷/ دہشت گردی کے خلاف جنگ، VI، ۸۵، ۱۱۰، ۱۲۳، ۱۸۹
دولت کی غیر مساویانہ تقسیم، ۶۷
دی اکنامسٹ The Economist، ۹۰
دینی تعلیم، ۷۵

ڈ

ڈان، روزنامہ، ۱۰۵
ڈپٹی اپوزیشن لیڈر، ۱۲
ڈرگ پالیسی، ۱۷۱
ڈرون حملے، ۸۵، ۹۴، ۱۱۰، ۱۱۷، ۱۴۳
ڈمہ ڈولا، ۱۴۶
ڈیرہ غازی خان، ۱۲
ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، ۱۳۶
ڈیموکریٹس، ۳۴
ڈینیل ڈیواوڈ، جج، ۱۰۵

ر

رابرٹ پاپ (Robert Pape)، ۱۸۹
رابرٹ گیٹس (Robert Gates)، ۱۲۳
رابرٹ رسل (Robert Russel)، ۱۰
راجستھان، ۷
راجہ محمد امین (سیکرٹری)، ۱۴۵، ۱۷۸
رائس کارپوریشن، ۱۷۱
رحمٰن ملک (وزیر داخلہ)، ۲۹، ۱۲۵
رسول ﷺ، ۱۴، ۶۴، ۶۵ / رسولؐ کے احکام، ۶۴
رولز آف بزنس، ۱۳۵، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۷۰، ۱۸۱
ریاستی پالیسی، ۱۸۱
ریمنڈ ڈیوس، ۱۱۷، ۱۸۵

ز

زرِ تلافی، ۱۰۹
زراعت، ۷۲، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۹
زرداری، آصف علی (صدر)، ۲۹، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۵، ۱۰۷، ۱۱۵، ۱۱۸، ۱۶۴
زرداری کی نفسیاتی و جسمانی صحت، ۹۱
زرِ مبادلہ کے ذخائر، ۶
زکوٰۃ و عشر، ۱۷۱
زیرِ زمین وسائل، ۱۱۴

ژ

ژوب، ۱۱۴

س

سائنس اور ٹیکنالوجی، ۸۷
سپاہ آزادی، ۹۳
سپر پاور کی تحدیدات، ۷۹
سپر پاورز کا قبرستان، ۷۹
سپریم کورٹ، ۳، ۷، ۱۲، ۱۸، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۸، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۲۰، ۱۲۲، ۱۲۵، ۱۳۳، ۱۳۹
سٹیل ملز، ۱۲۶
سرخ لکیر، ۴۶، ۴۷، ۴۹
سرخسی (علامہ ابو بکر محمد بن ابی سہل سرخسی)، ۱۱
سردار بلخ شیر مزاری، ۱۲
سردار محمد خان لغاری، ۱۲
سرکاری اداروں کے ڈھانچے کی تدوین نو، ۱۱۵
سرمایہ داری، ۷۹
سرے محل، ۱۰۷
سلامتی کے معاملات، ۶۳ / سلامتی پالیسی، ۸۵ / سلامتی کا انحصار، ۶۸، ۶۹
سماجی تحفظ کے معاملات، ۳۹
سماجی معاہدہ، ۱۷
سنت رسول ﷺ، ۱۱
سندھ، ۱۰۳، ۱۱۸، ۱۷۱

سنڈریلا کی کہانی، ۸۹
سول سروس، ۱۲، ۱۰۸
سول سرونٹ ترمیمی آرڈیننس، ۱۳۶
سونا، ۱۱۲
سوویت یونین، ۷۹
سوئٹزرلینڈ، ۹۰، ۹۱، ۱۰۵
سوئس بینک، ۱۰۵، ۱۰۷/ سوئس عدالت، ۱۰۵، ۱۰۷/ سوئس مقدمات، ۹۷، ۱۰۵
سوئی، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۳۹
سوئی سدرن گیس، ۱۱۴
سوئی گیس، ۱۳۹
سی آئی اے، ۱۲۳
سیاسی آزادی، ۶۸/ سیاسی جماعتوں کے قانون، ۴۸/ سیاسی خود کشی، ۱۰۸/ سیاسی روایات، ۹۳/ سیاسی نظام، ۱۵۸
سید علی گیلانی، ۷۸
سینٹر کور، ۴۶
سینڈیک منصوبے، ۱۱۴
سینیٹ، ۱، ۳، ۸، ۱۰، ۱۳، ۱۶، ۱۷، ۱۹، ۲۱، ۲۵، ۲۷، ۲۸، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۹، ۴۱، ۴۵، ۴۹، ۵۱، ۵۲، ۷۱، ۷۵، ۸۱، ۹۴، ۱۰۴، ۱۰۷، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۲۹، ۱۳۱، ۱۳۷، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۱، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۷، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۵/ سینیٹ آف پاکستان، ۱۲۹، ۱۵۹، ۱۶۲، ۱۶۷
سینیٹ کے انتخاب کا طریقۂ کار، ۱۷۳/ سینیٹ کی قرار دادیں، ۱۷۳/ سینیٹ کے مالیاتی اختیارات، ۱۷۲/ پارلیمانی اختیارات، ۶۲
سینیٹر احمد علی، ۱۶۲
سینیٹر اسحاق ڈار، ۱۶۲، ۳۳، ۳۵، ۳۶، ۸۶، ۱۰۰
سینیٹر اعتزاز احسن، ۹۱
سینیٹر ایس ایم ظفر، ۱۷
سینیٹر بابر اعوان، ۱۶۲، ۱۰۴
سینیٹر جنرل سعید قادر، ۱۴۴
سینیٹر چوہدری محمد انور بھنڈر، ۱۴۶، ۱۴۷
سینیٹر راجہ ظفر الحق، ۳۴، ۵۱
سینیٹر رضا ربانی، ۸، ۱۹، ۳۴، ۵۰، ۹۴، ۱۱۲، ۱۱۹، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۵۲
سینیٹر سرتاج عزیز، ۱۴۴
سینیٹر شیری رحمٰن، ۹۲، ۹۳
سینیٹر ظفر علی شاہ، ۱۴۱
سینیٹر کامران مرتضیٰ، ۱۴۶
سینیٹر منظور احمد گچکی، ۴
سینیٹر مولانا عبدالغفور حیدری، ۳۱، ۳۵، ۳۶، ۱۴۶
سینیٹر نوید قمر، ۱۰۰
سینیٹر کرنل سیّد طاہر حسین مشہدی، ۱۴۵
سینیٹر ہارون اختر، ۱۶۲

ش

شرلی ولیمز (Shirley Williams)، ۴۷
شعبہ تحقیق، ۱۷۴، ۱۷۹
شکاگو یونیورسٹی، ۱۸۹
شمالی اتحاد، ۷۷
شنوائی کا حق، ۴۰
شہری حکومت، ۷۰
شوکت ترین (وزیر خزانہ)، ۱۰۰
شوکت عزیز سٹی بینک، ۸۷
شوگر انڈسٹری کی رپورٹ، ۱۷۱
شوگر کی کھاد، ۱۱۲
شیر افگن، سابق وزیر، ۱۴۵

ص

صحت کی پالیسی، ۷۶
صدارتی انتخاب، ۱، ۷، ۱۰، ۹۲
صدارتی نظام، ۶۲، ۸۴، ۱۲۰
صدر کا حلقہ انتخاب، ۳۷ / صدر کا حلف، ۲۷
صوبائی خود مختاری، ۱۰۲

ض

ضرر رساں انتظامی فیصلے، ۳۹

ط

طاغوتی طاقتیں، V
طالبان، ۹۰
طلبہ یونین کی بحالی، ۸۴

ع

عاصم حسین، ڈاکٹر، وزیر پٹرولیم، ۱۴۹
عافیہ صدیقی، ڈاکٹر، ۱۸۸
عالمی بینک (ورلڈ بینک)، ۶۶، ۱۰۹، ۱۱۱، ۱۲۲
عبدالحفیظ شیخ (وزیر خزانہ)، ۸۷، ۱۰۰، ۱۵۹
عبدالمالک، ڈاکٹر، ۲۰
عبوری آئینی حکم (PCO)، ۲۲
عدالتی نظام، ۷۰
عدلیہ، ۱۸، ۲۲، ۲۴، ۲۶، ۲۸، ۲۹، ۶۶، ۷۰، ۷۳، ۷۹، ۸۳، ۸۸، ۱۰۴، ۱۰۶، ۱۷۶
عدلیہ کی آزادی، ۲۲، ۷۳ / عدلیہ کی بحالی کی تحریک، ۲۶
عدم اعتماد کی تحریک، ۱۵۸
عراق، ۷۹، ۱۸۹
عسکریت پسند، ۸۵
علی محمد خان ہوتی، ۱۳
عوامی نیشنل پارٹی، ۳۱

غ

غذائی تحفظ، ۹۹، ۱۰۱
غربت، ۶۷، ۷۰، ۷۴، ۸۱، ۱۱۳، ۱۲۲، ۱۸۸ / غربت کی لکیر، ۱۲۲
غریب پرور بجٹ، ۱۲۶
غلام اسحٰق خان (صدر)، ۳، ۵، ۱۴۴
غیر آئینی اقدام، ۲۴ / غیر دستوری اقدام، ۲۳
غیر وابستہ، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵
غیر جانبدار تحریک، ۷۸

ف

فاٹا، ۵۳
فارورڈ بلاک، ۴۶
فاروق لغاری (صدر)، ۱۲، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۹۲
فضل الٰہی، چوہدری (صدر)، ۱۶
فہمیدہ مرزا، محترمہ، (اسپیکر)، ۹۸
فرانس، ۵، ۷۷ / فرانس کا انقلاب، ۷۷
فرانسس متراں (Francois Mitterrand)
سوشلسٹ صدر، ۵
فرقہ پرستوں، ۵۹
فرنٹیئر کانسٹیبلری، ۱۱۳
فرنٹیئر کرائم ریگولیشنز، ۸۱
فصلوں کی انشورنس، ۱۰۱
فلپ سالٹیل، ڈاکٹر، ۹۱
فلسطین، ۱۲۳
فنانس اسٹینڈنگ کمیٹی، ۱۵۹
فنانس ترمیمی بل، ۱۵۹، ۱۶۲

فنانشل ٹائمز، ۹۱
فوج کا کردار، ۶۲، ۷۲/ فوج کی سیاست میں مداخلت، ۶۸/ فوج کی مداخلت، ۶۹، ۷۳
فوجی استعداد، ۶۹
فوجی وردی میں صدارتی انتخاب، ۱
فوڈ سیکورٹی، ۱۸۸
فیڈریشن اور دستور کا فریم ورک، ۹۳
فیصل شہزاد، ۱۱۱

ق

قانون، ۶۵
قانون سازی کے بنیادی اصول، ۱۳۲
قانون ضرورت، ۱۲
قانونِ فوجداری، ۱۳۶
قانون کی حکمرانی، ۱۰۲، ۱۰۴، ۱۳۸
قانونی جواز، ۷۵، ۱۲۴، ۱۲۶
قائدِ اعظم، ۶۳، ۱۸۶
قراردادِ مقاصد، ۱۷۲
قرآن پاک، V، ۱۱، ۳۶، ۳۷
قرآن و سنت، V، ۶۴
قلعہ سیف اللہ، ۱۱۴
قلعہ عبداللہ، ۱۱۴
قومی اسمبلی، ۱۰، ۱۲، ۱۷، ۱۸، ۲۴، ۳۴، ۴۵، ۶۰، ۹۲، ۹۸، ۱۲۹، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۷، ۱۴۴، ۱۴۹، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۳، ۱۷۰، ۱۷۴، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱
قومی انتخابات، ۶۰
قومی سلامتی کونسل، ۱۸
قومی عزت و وقار، ۷۷
قومی مالیاتی ایوارڈ، ۱۰۲، ۱۰۳
قومی مالیاتی کمیشن، ۱۱۳
قیمتوں پر کنٹرول، ۱۳۶

ک

کافر، ۶۵
کامران عزیز خان جرنل آف پاکستان ویژن، ۱۸
کامل علی آغا، ۲۰
کانگریس، ۴۲، ۴۷
کانگریس پارٹی، ۴۲
کانگریس کی حکومت، ۴۲
کتاب المقصود، ۱۱
کشیر جماعتی پالیسیاں، ۴۷
کراچی، ۶۷، ۱۰۰، ۱۲۵
کرپشن، ۵۹، ۶۱، ۶۶، ۶۹، ۸۸، ۹۷، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۲۲، ۱۲۴، ۱۲۷، ۱۸۸/ کرپشن کا بازار، ۱۰۶
کرنسی پالیسی، ۱۰۹
کسٹم ایکٹ، ۱۱۳
کشمیر، ۷، ۵۹، ۶۷، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۱، ۸۴، ۹۳، ۱۲۳
کشمیر پالیسی، ۷۷/ کشمیر پر پیش رفت، ۷۷/ مقبوضہ کشمیر، ۹۳
کمانڈو ایکشن، ۶۰/ کمانڈو کا کردار، ۸۰
کمیٹی برائے قانون سازی، ۱۳۷
کمیٹی سسٹم، ۱۷۰، ۱۸۲
کنٹونمنٹ کی تعمیر، ۱۱۳
کنزرویٹو، ۳۴
کوسٹ گارڈ، ۱۱۳، ۱۱۴
کول (M.N. Kaul)، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۵۳، ۱۲۵، ۱۴۸
کوہلو، ۱۱۳، ۱۱۴
کوئٹہ، ۱۱۴
کیپٹل ہل، ۱۱۱
کیمبرج سسٹم، ۷۵
کیوبا، ۱۲۳

گ

گارڈین، ۱۲۱
گردشی قرضے، ۱۱۵
گندھک، ۱۱۲
گوادر، ۱۰۳، ۱۱۳
گورنر جنرل، ۱۳۲/ گورنر راج، ۲۸
گیلانی، یوسف رضا (وزیر اعظم)، ۲۹، ۱۰۵
گیس، ۲۵، ۱۰۹، ۱۱۲، ۱۱۴، ۱۲۷، ۱۳۹
گیس ڈویلپمنٹ سرچارج، ۱۱۴
گیس کا بحران، ۱۲۷

ل

لاپتا افراد کا مسئلہ، ۱۸۸
لاطینی امریکہ، ۱۲۳
لال مسجد، ۱۸۹
لانگ مارچ، ۲۶، ۲۹
لاہور، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۳۹، ۱۸۵
لاہور ہائی کورٹ، ۱۱۸
لائن آف کنٹرول، ۶۷، ۷۸
لبرل پارٹی، ۴۷
لبرل ڈیموکریٹک، ۴۷
لبرلز، ۳۴
لغاری قبیلہ، ۱۲
لوٹا کریسی، ۴۶، ۴۷، ۵۴
لوڈشیڈنگ، ۱۰۰
لوکل باڈیز آرڈیننس، ۱۸
لیاقت بلوچ، ۱۷
لیبر پارٹی، ۴۷، ۳۴
لیڈر آف دی اپوزیشن، ۲۰
لیگل فریم ورک آرڈر، ۱۶۳

م

مارشل لاء، ۱۰، ۲۳، ۲۸، ۷۲، ۱۶۳
مارننگ نیوز (Morning News)، ۹۵
مالیاتی بحران، ۸۶/ مالیاتی خسارہ، ۲۵، ۶۶
ماورائے آئین اقدام، ۲۳
مجلس شوریٰ، ۶۰
محبوب علی (ایڈیشنل سیکرٹری)، ۱۴۵، ۱۷۸
محفوظ پناہ گاہ، ۱۲۳
محکمہ ریونیو، ۷۰
مخدوم امین فہیم، ۷، ۱۴۸
مخلوط مذاکرات، ۷۸
مرار جی ڈیسائی، وزیر اعظم، ۵
مزدور انجمنیں، ۸۴/ مزدور یونین کی بحالی، ۸۴
مسلم لیگ، ۷، ۱۷، ۲۵، ۲۹، ۳۱، ۳۴، ۳۵، ۴۸، ۵۰، ۵۵، ۷۹، ۸۳، ۱۸۹
مسلمانانِ ہندوپاک، ۱۸۶
مسئلہ بلوچستان، ۱۸۸
مشترکہ اپوزیشن، ۵۰
مشترکہ فہرست، ۷۳، ۱۱۳
مشنز کونسل، ۸۶
مصالحت کاری، ۱۳۶
معاشی استحکام، ۱۰۲
معاشی پالیسی، ۷۴، ۷۹، ۱۰۰/ معاشی پالیسی کا جائزہ، ۷۴
معاشی ترقی، ۶۱، ۶۶، ۷۴، ۱۲۲، ۱۲۴/ معاشی صورت حال، ۸۷، ۱۰۰/ معاشی مضبوطی، ۶۸/ معیشت کی صورت حال، ۱۸۸
معدنی وسائل، ۱۱۲
معیشت کی دستاویز بندی، ۱۱۵
معین قریشی (سابق نگراں وزیر اعظم)، ۳
مغربی میڈیا، ۹۱

مقامی حکومت، ۷۳، ۷۹
ملک کی آزادی، ۶۱، ۱۱۲، ۱۸۵
ملکی سلامتی کا تحفظ، ۷۷
منی لانڈرنگ، ۹۰، ۱۰۵، ۱۰۷
مہمند کا علاقے، ۱۸۵
مؤثر بہ ماضی حکم، ۱۳۹
مولانا شبلی نعمانی، ۶۶
مولانا فضل الرحمٰن، ۱۷
مومن خان مومن، ۸۴
میثاق جمہوریت، ۸۴
میثاق معیشت، ۱۱۵
میڈیکل رپورٹس، ۹۱
میرپور، ۷
میر درد، ۶۸

ن

ناجائز منافع خوری، ۱۳۶
نام نہاد امریکی جنگ، ۱۱۷
نائن الیون کا واقعہ، ۶۳
نجی تعلیمی ادارے، ۷۵
نظریاتی شناخت، ۱۸۶
نظریہ پاکستان، ۷۹
نفاذ شریعت، ۱۶۷
نکارا گوا، ۱۲۳
نماز، ۶۴
نوآبادیاتی نظام، ۱۲۶، ۱۳۲
نواب اسلم خان رئیسانی (وزیر اعلیٰ)، ۱۰۴
نواب اکبر بگٹی، ۱۱۳، ۱۸۹
نواب ذوالفقار علی خان (گورنر)، ۱۰۴
نواز شریف، میاں (وزیر اعظم)، ۳، ۵، ۹۰، ۱۰۵
نور جہاں، ڈاکٹر، پانیزئی (ڈپٹی چیئرپرسن سینیٹ)، ۱۳
نیب، ۱۰۵، ۱۲۵، ۱۲۶
نیٹو ہیلی کاپٹر، ۱۸۵
نیشن، ۸۶
نیشنل اسمبلی، ۷۱، ۱۰۷، ۱۷۹
نیشنل ڈائیلاگ، ۱۱۵
نیشنل ڈیفنس کالج، ۶۹، ۷۲
نیشنل سیکورٹی، ۷۲، ۱۱۴ / نیشنل سیکورٹی کونسل، ۷۲
نیشنل فنانس کمیشن، ۱۰۳
نیویارک، ۹۱

و

واجد شمس الحسن، ۹۱
واشنگٹن، ۶۴
وال اسٹریٹ جرنل، ۹۱، ۹۳
وحدانی نظام، ۷۳
وحی، V
وزارتِ قانون، ۱۳۷، ۱۴۱
وزیرِ قانون، ۲۳، ۱۰۴، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۸
وسائل کی تقسیم، ۷۰
وفاق کی علامت، ۹۸، ۱۱۸
وفاقی شرعی عدالت، ۱۷۳
وفاقی کابینہ، ۳۱، ۱۴۸
وکی لیکس، ۱۲۱
ووٹ کا تقدس، ۶

ہ

ہاؤس آف لارڈز، ۱۷۰
ہائی کورٹ، ۴۸، ۱۰۴، ۱۱۳، ۱۱۸، ۱۳۹
ہجرت، ۱۸۶
ہندوستان، ۵، ۷، ۳۴، ۷۶، ۷۸، ۱۲۵، ۱۳۲، ۱۸۳

ہندوستان کی پارلیمنٹ، ۳۴، ۱۲۵
ہندوستان کی تاریخ، ۱۳۲
ہیرالڈ ٹریبیون (Herald Tribune)، ۸۵
ہیل فائر میزائل (Hellfire missiles)، ۸۵، ۹۵
ہلیری کلنٹن (Hillary Clinton)، امریکی وزیر خارجہ، ۱۱۱، ۱۲۳

ی

یو بی ایل کی پرائیویٹائزیشن، ۱۷۱
یورپی کمیونٹی، ۱۰۹
یونیورسل پرائمری تعلیم، ۱۰۱